مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

مدیر مسئول
(مولانا) مشرف علی تھانوی

ماہنامہ
الامداد
لاہور پاکستان

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۹ | جمادی الاول ۱۴۳۹ھ | فروری ۲۰۱۸ء | شمارہ ۲

وعظ الحیوۃ

حیات دائمی

ازافادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات وحواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے
زر سالانہ =/۴۰۰ روپے

ناشر: (مولانا) مشرّف علی تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

ماہنامہ الامداد لاہور

۳۵۴۲۲۲۱۳
۳۵۴۳۳۰۴۹
پتہ دفتر
جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

وعظ الحیوۃ
(حیات دائمی)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	خطبۂ ماثورہ.....	۹
۲.....	فلاح کا طریقہ.....	۹
۳.....	ذکر اللہ اور دنیا.....	۱۱
۴.....	یادِ محبوب کی تمثیل.....	۱۲
۵.....	نیت کی اہمیت.....	۱۳
۶.....	مومن کی شان.....	۱۳
۷.....	دنیا کی دُھن.....	۱۵
۸.....	راحت قلب.....	۱۷
۹.....	کامیابی کی حقیقت.....	۱۸
۱۰.....	اہل حال واہل مقام.....	۱۹
۱۱.....	اہل حال اور اہل مقام کی مثال.....	۲۰
۱۲.....	کامل کا حال.....	۲۱
۱۳.....	تفویض اور راحت.....	۲۲
۱۴.....	اہل اللہ کا حال.....	۲۳

۱۵.....	اہل اللہ کا مقام تفویض.....	۲۴
۱۶.....	تفویض کا فائدہ.....	۲۵
۱۷.....	نعمت دنیا وآخرت.....	۲۶
۱۸.....	ترجیح دنیا کی مذمت.....	۲۸
۱۹.....	طلب دنیا اور حب دنیا میں فرق.....	۲۸
۲۰.....	علامت حب اللہ.....	۲۹
۲۱.....	محبت کا فائدہ.....	۳۰
۲۲.....	ارادہ کی تفسیر.....	۳۱
۲۳.....	بقدر ضرورت دنیا کا حصول.....	۳۳
۲۴.....	مقتضاء عشق.....	۳۴
۲۵.....	اعمال کی حقیقت.....	۳۵
۲۶.....	عبدیت اور رسالت.....	۳۶
۲۷.....	عمل اور جنت.....	۳۷
۲۸.....	محبت اور اطاعت.....	۳۹
۲۹.....	خواجہ عبیداللہ احرار کی حالت.....	۴۰
۳۰.....	کمالات انبیاء.....	۴۲
۳۱.....	شان اولیاء.....	۴۴
۳۲.....	حضرت سلیمان اور سلطنت.....	۴۶

۳۳..... ایمان اور تردد ۴۶

۳۴..... شبہ کا جواب ۴۷

۳۵..... مطلق تردد ایمان کے منافی نہیں ۴۸

۳۶..... قرآن اور ترجمہ ۴۹

۳۷..... وساوس اور اسباب ۵۰

۳۸..... فضیلت آخرت ۵۱

۳۹..... مومن اور دنیوی متاع ۵۳

۴۰..... تارک الدنیا اور متروک الدنیا ۵۴

۴۱..... حب حق ۵۵

۴۲..... طریق اصلاح ۵۷

۴۳..... بچوں کی تربیت ۵۹

۴۴..... اہل اللہ کی صحبت ۶۱

۴۵..... حکیم الامت کا طریقہ علاج ۶۲

۴۶..... علم اور اصلاح علم ۶۳

۴۷..... اہل اللہ کا کام ۶۴

۴۸..... اہل اللہ کی قوت قلبیہ وجسمانیہ ۶۵

۴۹..... چلہ کی ضرورت ۶۶

۵۰..... حیات آخرت ۶۷

۵۱..... کچھ عورتوں کے متعلق..... ۶۸
۵۲..... گناہوں سے بچنے کی تدبیر..... ۶۹
۵۳..... علاج شیخ کی اہمیت..... ۷۱
۵۴..... مداومت کی ضرورت..... ۷۲

وعظ

وعظ الحیوۃ

(حیات دائمی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم .اما بعد

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے وعظ الحیٰوۃ ۱۲/ رجب ۱۳۳۷ھ کو مولانا محمد انوار الحسن صاحب رئیس کاکوری ضلع لکھنو کے مکان میں تخت پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا سامعین تقریباً ایک ہزار تھے مستورات کا مجمع بھی تھا ۴ گھنٹے میں ختم ہوا حکیم محمد یوسف صاحب بجنوری نے قلم بند کیا۔ حکیم الامت نے اس سے قبل ایک وعظ بنام الصلوٰۃ اس سے قبل کی آیت پر بیان کیا تھا جس میں نماز کی افادیت واہمیت کو بیان کیا گیا تھا دارالعلوم سے یہ وعظ جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ میں طبع ہوا تھا۔ اب اس وعظ میں بیان فرمایا ہے کہ لوگ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں حالانکہ قابل ترجیح آخرت ہے کیونکہ وہاں حیات دائمی حاصل ہوگی دنیا میں حیات عارضی ہے، کسب دنیا کی اجازت ہے اور حب دنیا کی ممانعت ہے طریق تحصیل آخرت اہل اللہ کی صحبت کا اختیار کرنا ہے انتہائی مفید وعظ ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۲۸/ ربیع الاول ۱۴۳۹ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ﴾(۱)

فلاح کا طریقہ

اس آیت کے اختیار کرنے کی وجہ جیسے یہ ہے کہ اس میں ایک ضروری مضمون مذکور ہے ایسے ہی اختیار کرنے کے معین یہ امر بھی ہے کہ قریب ہی زمانہ ہوا کہ اس کے قبل اس سے پہلے کی آیات کے متعلق بیان ہو چکا ہے چونکہ یہ اسی سلسلہ میں ہے اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس مضمون کو پورا کر دیا جائے۔ اس لیے اس وقت اس آیت کو اختیار کیا گیا حق تعالیٰ نے اس آیت میں ایک ضروری مضمون ارشاد فرمایا ہے اور اس کے قبل بھی ایک ضروری مضمون بیان ہو رہا ہے جو مرتبط اس جملہ سے ہے۔

وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے اس کے قبل فلاح کا طریقہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاح کامل کا طریقہ یہ ہے کہ ایک تو تزکیہ ہو کہ نفس کو برے عقائد اور اخلاق ذمیمہ سے پاک کرے۔

(۱) ''(مگر اے منکرو تم آخرت کا سامان نہیں کرتے بلکہ) تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو حالانکہ آخرت (دنیا سے) بدرجہ بہتر ہے اور پائیدار ہے'' سورۃ الاعلیٰ: ۱۶۔۱۷۔

دوسرے ذکر ہو کہ خدا تعالیٰ کا نام لیا کرے اور ذکر زبان کی عبادت ہے جیسے کہ تزکیہ عقائد فاسدہ اور اخلاق ذمیمہ (۱) سے قلب کی عبادت ہے۔

تیسرے صلوٰۃ ہے اس کو مع اس کے حقوق کے ادا کرے کیونکہ نماز کامل وہی ہے جو مع حقوق کے ادا کی جائے۔

غرض تین چیزیں ہیں۔فلاح کا طریقہ، قلب ونفس کا پاک کرنا اور زبان سے ذکر کرنا اور جوارح سے اعمال کرنا اور اگر زبان کو جوارح سے مانا جائے تو دو چیزیں نکلیں گی۔ ایک قلب ونفس کا پاک کرنا جو باطن کے متعلق ہے دوسرے جوارح (۲) کو اعمال ظاہری سے آراستہ کرنا یہ ظاہر کے متعلق ہے خلاصہ یہ کہ ظاہر وباطن دونوں کو درست کرنا۔ یہ ہے فلاح کا طریقہ۔

اس مضمون کا مفصل بیان ہو چکا ہے۔ اس لیے اب بقیہ مضمون جو اس آیت کے اندر مذکور ہے بیان کیا جاتا ہے۔تاکہ اس مضمون کی تکمیل ہو جائے۔

میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے۔ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۔"بل" اس میں اضراب کے واسطے ہے جس کے معنی ہیں اعراض کرنا ایک بات سے دوسری بات کی طرف۔ جیسے یوں کہیں جاء زید بل عمرو ۔تو اس کے یہ معنی ہیں کہ زید کی طرف جو نسبت آنے کی تھی اس سے رجوع کر کے یہ نسبت عمرو کی طرف کی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فلاح کا طریقہ تو وہ ہے جو بتلایا گیا۔ تمہیں اسی طریقے کو اختیار کرنا چاہئے تھا۔ اس کے اختیار کرنے سے فلاح حاصل ہوتی مگر اس کو اختیار نہیں کرتے۔ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بلکہ تم اس سے اعراض کر کے اور اسکو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہو۔ جس سے فلاح حاصل نہیں ہو سکتی۔

اس میں مدعیان عقل کی غلطی بیان کر رہے ہیں کہ فلاح کا طریقہ وہ ہے جو ہم نے بیان کیا ہے نہ وہ جس کو تم نے اختیار کر رکھا ہے یوں فلاح تو سب کو

(۱) برے عقائد کی درستی دل کا تزکیہ ہے (۲) اعضاء۔

مطلوب ہے اس میں کسی کو کلام نہیں مقصود اصلی سب کا یہی ہے باقی اس کے طریقے میں اختلاف ہے مدعیان عقل تو فلاح کا طریقہ اور بتاتے ہیں اور حق تعالیٰ دوسرا طریقہ ارشاد فرمارہے ہیں اور بتلارہے ہیں کہ اس طریقہ کو اختیار کروگے تو فلاح ہوگی نہ اس طریقہ سے جس کو تم نے اختیار کررکھا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ فلاح تو مطلوب عام ہے یعنی سب اسی کو چاہتے ہیں کسی کو بھی اس میں تردد نہیں مگر اس کے طریقہ تعیین میں غلطی واقع ہوئی ہے۔

ذکر اللہ اور دنیا

اس آیت میں دو دعوے ہوئے ایک تو یہ کہ تم لوگ ترجیح دے رہے ہو دنیوی زندگی کو آخرت پر دوسرے یہ کہ اس سے فلاح حاصل نہ ہوگی پہلا دعویٰ تو بدیہی بلکہ حسی ہے چنانچہ لوگوں کے معاملات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ شب وروز دنیا ہی میں منہمک اور اسی کی دھن میں لگے ہوئے ہیں یہاں تک دین سے بے تعلقی ہے کہ اگر دین کو بھی اختیار کرتے ہیں تو اس میں بھی دنیا کی آمیزش ہوتی ہے۔ حالانکہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ دنیا میں بھی دین ہی کی شان ہوتی ہے چنانچہ اہل ایمان کی شان کو ایک اور موقع پر حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ ﴿لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ﴾(۱) یعنی ان کی یہ شان ہے کہ تجارت اور بیع ان کو ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی۔

تجارت تو اس کو کہتے ہیں جو بڑا معاملہ ہو اور بیع چھوٹے اور بڑے معاملہ دونوں کو شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ بڑا معاملہ ان کو ذکر اللہ سے غافل کرتا ہے اور نہ چھوٹا معاملہ غافل کرتا ہے۔ سو یہ شان ہوا کرتی ہے اہل ایمان کی اور اس پر کچھ تعجب نہ کیجئے کہ ذکر اللہ اور دنیا میں اجتماع کیسے ہوسکتا ہے کیونکہ اس کے نظائر موجود ہیں۔

(۱) سورۃ النور: ۳۷۔

یادِ محبوب کی تمثیل

مثلاً کسی کو کسی سے محبت ہو جائے اور مدت کے بعد اس کی تمنا پوری ہو کہ محبوب اسے ملنے کے لیے بلائے تو وہ چاہے گا کہ ایسا بن کر جاؤں کہ اس کے نزدیک بے قدر نہ ہوں۔ آدمیوں کی شکل سے جاؤں کیونکہ اس میں محبوب کی بے قدری ہے کہ چماروں (۱) کی طرح اس کے سامنے چلا جائے ظاہر ہے کہ جب محبوب کے سامنے انسانیت کی شکل اور آدمیت کے جامہ میں ہو کر جانا چاہے گا تو اول خط بنوائے گا۔ غسل کرے گا خط بنوا کر پاک صاف ہو کر اور اچھے کپڑے پہن کر تب اس کے سامنے جاوے گا پس وہ صورۃً تو غیر محبوب میں مشغول ہے مگر حقیقتاً محبوب ہی کی یاد میں مشغول ہے اس واسطے کہ وہ سارے کام محبوب ہی کے واسطے کر رہا ہے جو شخص ناواقف ہے وہ یوں خیال کرے گا کہ یہ عاشق نہیں ہے اور کہے گا کہ یہ کیسا عاشق ہے اگر واقعی عاشق ہوتا تو جب محبوب نے بلایا تھا فوراً دوڑ پڑتا ذرا بھی تامل نہ کرتا۔ اس کی کیا حالت ہے کہ محبوب کو چھوڑ کر سنگھار میں مصروف ہے اور یوں کہے گا کہ شاید یہ محبوب کو بھول گیا اسے محبوب کا دھیان نہیں رہا۔ اس پر محبت کا غلبہ نہیں لیکن اس بات کو عاشق جانتا ہے کہ وہ ہر حالت میں محبوب ہی کی یاد میں لگا ہوا ہے خط بنوا رہا ہے تو وہ بھی محبوب ہی کے واسطے اور غسل کر رہا ہے تو وہ بھی محبوب ہی کے لیے اور سنگھار کر رہا ہے تو وہ محبوب ہی کی خوشی کے واسطے۔ غرض ہر فعل اس کا محبوب کے لیے ہی ہے ہر کام میں اس کی یاد ہے کوئی کام اس کا اپنے نفس کے لیے نہیں اس کا تو کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں کہ جس میں یہ کہہ سکیں کہ یہ شخص محبوب سے غافل ہے۔ گو ظاہر میں وہ ایسے کام کر رہا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محبوب سے غافل ہے مگر واقع میں ذرہ برابر بھی اس کو محبوب سے غفلت نہیں ہے۔

(۱) بھنگیوں کی صورت اختیار کر کے۔

جب یہ بات ادنیٰ سے عشق میں ممکن ہے کہ نہ خط بنوانا محبوب کی یاد سے غافل کرتا ہے نہ غسل اور سنگھار کرنا غافل بناتا ہے پھر کیا تعجب کی بات ہے کہ حق تعالیٰ کے عاشق کو تجارت اور بیع اس کی یاد سے غافل کرے۔ خدا تعالیٰ کا عاشق تجارت کرتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے واسطے اور بیع کرتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کے واسطے جیسے عاشق مجازی ہر کام محبوب کے تعلق سے کرتا ہے اسی طرح یہ بھی ہر کام محبوب حقیقی کے تعلق سے کرتا ہے یہ کوئی کام اپنے نفس کے لیے کرتا ہی نہیں پس اس کی تو نظیر دنیا میں موجود ہے بہرحال مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ دنیا کا کام کرے تو اس میں دین ہی ملحوظ ہو۔

نیت کی اہمیت

ایک حکایت ہے کہ کسی بزرگ کے ایک مرید نے مکان بنوایا تھا۔ جب بن کر تیار ہوگیا تو شیخ کو مکان دکھانے لے گئے۔ اس مکان میں روشندان کھلے ہوئے تھے شیخ نے پوچھا کہ یہ روشندان کس غرض سے رکھے گئے ہیں مرید نے کہا کہ یہ اس واسطے رکھے ہیں کہ مکان میں روشنی آیا کرے یہ سن کر شیخ نے ایک آہ کھینچی اور کہا کم بخت اگر بنانے کے وقت یہی نیت کر لیتا کہ ان سے اذان کی آواز آیا کرے تو تیرا مقصود تو جب بھی حاصل ہوجاتا کیونکہ روشنی کا آنا تو اس کی نیت کرنے پر موقوف نہیں ہے اور اس کے ساتھ جب تک روشندان باقی رہتے اجر بھی ملتا۔

مومن کی شان

آخر یہ کیا بات تھی جو یہ بزرگ روشنی کی نیت سے روشن دان بنانے پر خفا ہوئے۔ بات یہ ہے کہ مسلمان کو دنیا میں بھی دین ہی مطلوب ہونا چاہئے واقعی اگر دنیا میں دین مطلوب ہو تو اس سے منافع دنیوی منقطع تھوڑا ہی[1] ہوجاویں گے کہ دنیا کے وہ منافع تو حاصل ہوتے ہی ہیں مگر نیت درست ہونے سے دین کا بھی بھلا ہوجاتا ہے۔

(۱) دنیاوی فوائد ختم تھوڑی ہوجائیں گے۔

مثلاً نکاح دنیا کا قصہ ہے اور کوئی اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے دین محض تو وہ ہے جو اہل اسلام کے ساتھ مخصوص ہو اور نکاح کافر مسلم دونوں میں مشترک ہے۔ بظاہر اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف دنیا کا قصہ ہے مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نیت یہ ہونا چاہئے کہ اس سے عفت (۱) محفوظ رہے اور طبیعت منتشر (۲) نہ ہو، اور جمعیت خاطر (۳) کے ساتھ عبادت ہوسکے۔ اگر اس نیت سے کرے گا تو نکاح عبادت ہوجاوے گا۔

اس سے بڑھ کر اور لیجئے کھانا پینا اور پہننا ہے دنیا ہی کا کام ہے کافر بھی کھاتے پیتے اور پہنتے ہیں اس میں دنیا ہی کا تو نفع ہے مگر اس میں بھی مسلمان کی شان وہ ہونی چاہئے جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو یہ نیت رکھنا چاہئے کہ اس لیے کھاتا پیتا ہوں کہ طاعت پر قوت ہو حق تعالیٰ کی نعمت کا تذکرہ ہو پس اس نیت سے کھانا پینا بھی عبادت ہوجاوے گا اسی طرح سے جتنے دنیوی امور ہیں ان سب میں دین کی نیت ہوسکتی ہے۔

اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسب الحلال فریضة بعد الفریضة (۴) یعنی جو فرائض شرعیہ ہیں نماز روزہ وغیرہ ان کے بعد کسب حلال بھی فرض ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کو فرض فرماتے ہیں تو پھر یہ دین کیسے نہ ہوگا۔

فرض کا تو دین کے اندر سب سے اعلیٰ درجہ ہے دین کے اندر بہت سے درجے ہیں واجب اور سنت اور فرض ان سب میں فرض اعلیٰ درجہ ہے لہٰذا کسب حلال اعلیٰ درجہ کی فرد ہوئی دین کی (۵) جب کہ اس میں نیت ہو کہ اہل وعیال کی خدمت کریں گے۔ حقوق کو ادا کریں گے۔

(۱) پاکدامنی (۲) پریشان (۳) دل جمعی (۴) حلیۃ الاولیاء: ۷/۱۶۲ (۵) دین کی اعلیٰ قسم ہوئی۔

حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ انسان جو بی بی کے پاس جاتا ہے اس سے بھی ثواب ملتا ہے کسی نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو اپنی خواہش کا پورا کرنا ہے اس پر کیوں ثواب ملتا ہے آپ نے جواب دیا کہ اگر اپنی خواہش کو بے محل صرف کرتا تو گناہ ہوتا یا نہیں؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے فرمایا تو جب حلال موقع میں صرف کرتا ہے تو ثواب بھی ملنا چاہئے۔

غرض مسلمان اس بنا پر دنیا دار ہو نہیں سکتا۔ اس لیے یہ محاورہ چھوڑ دینا چاہئے کہ ہم دنیادار ہیں مسلمان تو دیندار ہی ہے مسلمان کی دنیا بھی دین ہی ہے مگر یہ ضرور ہے کہ نیت کر کے اس کو دین بنانا چاہئے۔

لیجئے اس سے زیادہ کیمیا گر کون ہوگا۔ جس کو تانبے کا سونا بنانے کی ترکیب بتادی گئی ہے۔ متعارف کیمیا میں اول تو حکماء کا بھی اختلاف ہے کہ تانبے کا سونا بننا ممکن بھی ہے یا نہیں پھر اگر ممکن بھی ہو تو اس کا حاصل ہونا دشوار ہے۔ مگر یہ کیمیا کیسی سستی اور آسان ہے کہ دنیا کا تانبا تھوڑی سی آس سے جس کا نام نیت ہے سونا بن جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایسی کیمیا عطا فرمائی ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس سے منتفع نہیں ہوتے ذرا سی بات میں ہم دنیا کو دین بنا سکتے ہیں۔

دنیا کی دُھن

ہماری شان تو یہ ہونی چاہئے تھی کہ ہر امر میں (۱) دین ہی مقصود ہوتا۔ مگر حالت یہ ہے کہ ہم دین کو بھی دنیا بنا رہے ہیں حتی کہ بہت بڑی چیز ہے علم اور عبادت ہم عالم اور عابد ہونے کی بھی کوشش کرتے ہیں تو اس نیت سے کہ ہماری آبرو اور عزت ہو۔ ہماری طرف لوگوں کا اعتقاد ہو اور لیجئے اللہ اللہ کرنے والے سب سے بڑے طبقہ میں شمار ہیں جن کو صوفیا کے لقب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں بھی کثرت سے وہ لوگ ہیں جن کو کیفیات مقصود ہوتی ہیں۔ کیفیات کیا ہیں

(۱) ہر کام میں۔

اغراض دنیویہ ہی تو ہیں بس عام طور پر یہی حالت ہے کہ دین کو دنیا بنا رکھا ہے۔

بہرحال میں نے یہ تفریع اس پر کی ہے کہ مسلمانوں کو یہ محاورہ چھوڑ دینا چاہئے کہ ہم دنیادار ہیں مسلمان تو دنیادار ہو ہی نہیں سکتا۔ دنیادار تو اور ہی لوگ ہیں اور یہیں سے اس شعر کے معنی بھی حل ہو گئے کہ

اہل دنیا کافران مطلق اند روز وشب درزق زق ودر بق بق اند(۱)

ظاہراً تو یہ بہت سخت حکم معلوم ہوتا ہے کہ سارے دنیادار کافر ہیں کیونکہ اکثر مسلمان بھی تو دنیادار ہیں۔ پس اس سے لازم آتا ہے کہ وہ بھی کافر ہوں مگر ہمارے مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں جو لوگ سمجھتے ہیں۔ لوگوں نے اس شعر کی ترکیب سمجھنے میں غلطی کی ہے کہ اہل دنیا کو مبتداء اور کافران مطلق کو خبر قرار دیا ہے بلکہ اس کی ترکیب برعکس ہے یعنی کافران مطلق مبتداء موخر اور اہل دنیا خبر مقدم ہے(۱) معنی یہ ہیں کہ اہل دنیا کون لوگ ہیں کافر مطلق ہیں اہل دنیا کا مصداق بس کفار ہی ہیں مومن چاہے کیسا ہی ہو وہ حقیقتاً اہل دنیا نہیں۔ اس معنی کا قرینہ خود آگے موجود ہے کہ فرماتے ہیں۔

روز وشب در زق زق ودر بق بق اند

کیونکہ یہ شان تو کفار ہی کی ہے کہ دن رات دنیا کی زق زق اور بق بق(۲) میں مبتلا ہیں اور شب و روز دنیا ہی کی ان کو دھن ہے۔ کسی وقت بھی خدا کی یاد ان کی زبان اور دل میں نہیں آتی۔ چنانچہ تجربہ سے دیکھ لیجئے کہ جب ذکر کریں گے تو تجارت اور دنیا ہی کے جھگڑوں کا ذکر کریں گے۔ ریلوں میں دیکھئے تو یہی دنیا کے قصے لے کر بیٹھیں گے کہ تمہارے یہاں گیہوں کیا بھاؤ ہیں فلاں چیز کا نرخ کیا

(۱) ''یعنی صرف کفار اہل دنیا ہیں رات دن زق زق وبق بق میں گرفتار ہیں'' (۱) کافران مطلق اصل میں مبتداء ہے جس کو پہلے آنا چاہئے تھا اس کو بعد میں ذکر کیا اور اہل دنیا خبر ہے جو بعد میں آئی اس کو پہلے ذکر کیا جس سے معنی کی مذکورہ خوبی پیدا ہوئی (۲) جھک جھک اور بک بک یعنی بکواس کرنے میں مشغول ہیں۔

ہے۔یہی باتیں ہر وقت زبان پر رہتی ہیں اور اس کے سوا کوئی ذکر ہی نہیں اورمسلمان چاہے کیسا ہی ہو اس کی یہ حالت ہرگز نہیں ہوتی۔ اس کی کوئی نہ کوئی ساعت (۱) ایسی ضرور ہوگی کہ جس میں وہ حق سبحانہ وتعالیٰ سے ڈرتا ہوگا۔ مسلمان کسی نہ کسی وقت ضرور گھبرائے گا اور خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا۔ اگر زبان سے نہیں تو قلب میں ضرور خدا کو یاد کرے گا۔

طاعون میں دیکھئے کیا حالت تھی حق تعالیٰ اور آخرت کی طرف کیسی توجہ تھی۔ اگر مسلمانوں کے دل میں آخرت بسی ہوئی نہیں ہے تو اس کی یاد کیسے ہوتی ہے۔ بہرحال دنیادار کسی مسلمان کو نہیں کہہ سکتے۔ مسلمان تو اہل دین ہی ہوگا۔

راحت قلب

ہاں اہل دین کے مراتب مختلف ہیں کوئی کم کوئی زیادہ جیسے عربی مدرسہ میں طلبا ہوتے ہیں کوئی میزان پڑھنے والا ہے۔ کوئی مشکوٰۃ پڑھتا ہے کوئی شمس بازغہ، مگر ہیں سب عربی پڑھنے والے۔ پس جتنے اہل اسلام ہیں سب اہل دین ہیں۔ کوئی کم کوئی زیادہ خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ دنیا کو بھی دین ہی بنائے مگر ایسا کرتے نہیں چنانچہ اپنی حالت کے تتبع سے (۲) معلوم ہوتا ہے کہ جو کام بھی ہم کرتے ہیں اس میں کوئی نہ کوئی آمیزش دنیاوی ہوتی ہے اور اس میں زیادہ مقصود دنیا ہی ہوتی ہے ہم نے اپنی یہ حالت کر رکھی ہے اور اس کو سمجھ رہے ہیں کہ یہی طریقہ ہے فلاح (۳) کا جب ہی تو رات دن دنیا میں کھپ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کسی کو سلطنت حاصل ہوجائے، اعلیٰ درجہ کی ترقی ہوجائے، حتی کہ بادشاہ ہوجائے مگر حقیقت میں جس کا نام کامیابی ہے وہ اس کو بھی میسر نہیں۔ ہاں اللہ والے کہہ سکتے ہیں کہ ان کو کامیابی میسر ہے۔

(۱) کوئی نہ کوئی لمحہ ایسا ضرور ہوگا (۲) اپنی حالت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے (۳) کامیابی۔

کامیابی کی حقیقت

میں مختصراً کامیابی کا ذکر کئے دیتا ہوں کہ وہ ہے کیا چیز۔ اول مقصود کا تعین ہونا چاہئے کہ مقصود کیا چیز ہے۔ تب معلوم ہوگا کہ وہ کس کو حاصل ہے تو وہ کامیاب ہے اور کس کو نہیں۔ سو وہ مقصود بس ایک چیز ہے، وہ کیا ہے راحت، جو بھی کوشش کرتے ہیں کامیابی کی اس سے مقصود سب کا راحت قلب ہے۔ جب یہ معلوم ہوگیا تو اب مشاہدہ کر لیجئے۔ بادشاہ کی حالت دیکھ لیجئے۔ ان کو راحت بھی نصیب ہے یا نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان کو راحت میسر نہیں ہے۔

راز اس کا یہ ہے کہ انہوں نے اپنے مقاصد متعین کر رکھے ہیں جن کے کچھ تو اسباب ہی اختیار میں نہیں اور بعض گو اختیاری تو ہیں مگر ان پر مقاصد کا ترتب یقینی نہیں (کہ جب وہ پائے جائیں تو مقصود بھی ضرور پایا جائیں) بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اسباب کو جمع کرتے ہیں مگر ثمرہ مرتب نہیں ہوتا۔ سو وہ لوگ چونکہ اپنے خیال میں اول ایک ثمرہ متعین کر لیتے ہیں کہ ایسا کرنے سے یہ ثمرہ حاصل ہوگا اور اس کی توقع پر ان اسباب کو مہیا کرتے ہیں اور پھر اکثر اس توقع کے خلاف پیش آتا ہے اور ان کی امید پورا نہیں ہوتی، اس لیے پریشان ہوتے ہیں۔ کیونکہ پریشانی کا حاصل کیا ہے۔ امید کا پورا نہ ہونا۔ پس جب وہ امید پوری نہیں ہوتی تو قلق ہوتا ہے[1]۔ یہ وجہ ہے ان لوگوں کی پریشانی کی بخلاف اہل دین کے کہ ان کا اصلی مقصود صرف آخرت ہے سو وہ اس کے اسباب مہیا کرتے ہیں اور اس کے جتنے اسباب ہیں وہ سب یقینی ہیں کہ ثمرہ کا ان پر مرتب ہونا لازمی ہے۔ تخلف ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی نماز پڑھے اور خدا تعالیٰ خوش نہ ہوں۔ یا کوئی اسلام لائے اور جنت نہ ملے رہی یہ بات کہ شاید اسلام پر خاتمہ نہ ہونے کی وجہ

(۱) رنج (۲) خلاف۔

سے جنت نہ ملے۔ سو یہ اس کے یقینی ہونے کے منافی نہیں (۱) کیونکہ منافات اس وقت ہوتی، جب کہ اسلام تو پایا جاتا اور پھر جنت نہ ملتی اور اس صورت میں تو اسلام ہی نہیں رہتا اور وہ بھی اپنے اختیار سے کیونکہ اسلام اس وقت تک نہیں جاتا جب تک کہ خود ہی اس کو نہ چھوڑے چونکہ اس باب آخر پر ثمرہ کا ترتب یقینی ہے اس لیے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کی امید پوری نہ ہو۔ پس ان کو پریشانی کیوں ہوگی کیونکہ پریشانی کی حقیقت تھی امید کا پورا نہ ہونا اور اسکا یہاں احتمال ہی نہیں اور اگر کسی موقع میں ان کو دنیا بھی مقصود ہوتی ہے تب بھی ان کو پریشانی نہیں ہوتی کیونکہ گو اس کے ثمرہ کا تخلف اسباب (۲) سے ممکن ہے مگر ان کا مذاق یہ ہے کہ وہ اس پر مصر نہیں ہوتے کہ اسباب پر ثمرہ ضروری ہی مرتب ہوجائے اگر ثمرہ مرتب نہ ہو تو وہ اس پر بھی راضی رہتے ہیں۔

ان کی حالت یہ ہے کہ وہ جس وقت کسی مریض کا علاج کرتے ہیں تو وہ گو یہ چاہتے ہیں کہ اچھا ہوجائے مگر قلب کو اس کے ساتھ ایسا متعلق نہیں کرتے کہ اگر صحت نہ ہو تو پریشان ہوجائیں۔ اگر صحت نہ بھی ہو تب بھی وہ راضی ہی رہتے ہیں۔

اہل حال واہل مقام

اب رہی یہ بات کہ یہ رضا عقلی ہے یا طبعی تو سمجھ لینا چاہئے کہ رضا طبعی تو ضروری نہیں البتہ رضا عقلی ضروری ہے ان حضرات کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ مریض کی صحت پر بھی راضی ہوتے ہیں اور عدم صحت پر بھی (۳)۔ اگر مریض مر بھی جائے تو طبعاً تو ایک قسم کا حزن (۴) ہوتا ہے مگر عقلاً اس پر بھی راضی ہوتے ہیں اور بعضوں کو طبعاً بھی کچھ اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ بعض اولیاء اللہ کی حکایت سنی ہے اور کتابوں میں موجود ہے کہ وہ اولاد کے مرنے پر ہنس دیئے۔ ان کو اس میں لذت ہوئی۔

(۱) خلاف (۲) اسباب کے خلاف اس کا وقوع ممکن ہے (۳) صحت نہ ہونے پر بھی (۴) غم۔

میں نے خود ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا تھے کسی نے پوچھا کہ کیسا مزاج ہے تو اس کو سن کر ہونٹوں پر تبسم تھا اور یوں کہا کہ خدا تعالیٰ کا شکر ہے ہنستے تھے حالانکہ سخت تکلیف میں مبتلا تھے۔

بعض اہل حال کی یہ حالت بھی ہوتی ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ایسے لوگوں کو اعلیٰ ترقی ہوگئی ہے بلکہ ان سے آگے اور مرتبہ کے لوگ ہیں جو ان کے مرتبہ کو پہنچ کر اور آگے بڑھ گئے ہیں۔ گو ان کی ظاہری حالت بڑھی ہوئی نہیں معلوم ہوتی اور عوام ان کو کچھ نہیں سمجھتے۔

اہل حال اور اہل مقام کی مثال

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک دریاء عظیم الشان ہے اور اس کے اس کنارے پر ایک شخص ہے اور ایک شخص اس کنارے پر اتر گیا ہے اور ایک تیسرا شخص دریا کے درمیان میں ہے اب میں پوچھتا ہوں کہ زیادہ کامل کون ہے؟ عبور اور عدم عبور کے اعتبار سے مقام کس کا بڑھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو دریا کو عبور کر گیا ہے وہ بڑھا ہوا ہے اور کامل السیر وہی ہے جو دوسرے کنارے پر پہنچ گیا ہے۔ مبتدی کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اس کنارہ پر کھڑا ہے۔ اور اہل حال کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو دریا کے بیچ میں ہے یہ شخص متوسط الحال۔ اور اہل مقام کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دریا سے پار ہوگیا ہے یہ شخص منتہی ہے۔ بظاہر تو مبتدی کی حالت میں اور اس کی حالت میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ دونوں کی حالت یکساں معلوم ہوتی ہے جو شخص ناواقف ہوگا وہ اس شخص کو جو پار اتر گیا ہے اس کنارے والے کے مثل سمجھے گا۔ کیونکہ جیسے یہ کنارہ پر ہے۔ ایسے ہی وہ بھی کنارہ پر ہے اس لیے ممکن ہے کہ اسے یہ گمان ہو کہ وہ اس کنارہ پر آنا چاہتا ہے اور جو شخص واقف ہے اور جانتا ہے کہ وہ دریا سے گزر کر اس جگہ آیا ہے تو وہ اس کو افضل سمجھے گا۔

کامل کا حال

بس تین قسم کے لوگ ہوئے۔ مبتدی، متوسط، منتہی۔ منتہی کی حالت ظاہر میں مبتدی کے مشابہ ہوتی ہے۔ اس لیے عوام کو دونوں میں امتیاز نہیں ہوتا اور اہل حال کی حالت ہے ممتاز اس لیے عوام ان کو بہت بڑا سمجھتے ہیں حالانکہ وہ ابھی درمیان میں ہیں چونکہ منتہی کی حالت مشابہ ہوتی ہے مبتدی کے اس لیے جیسے مبتدی کو بیٹے کے مرنے سے رونا آتا ہے منتہی کو بھی آتا ہے گو کہ اس کے رونے اور اس کے رونے میں زمین آسمان کا فرق ہے مگر ظاہری صورت دونوں کی یکساں ہوتی ہے۔

دیکھئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کے انتقال پر روئے اور جب بعض صحابہ نے اس پر تعجب کیا تو فرمایا کہ یہ رونا تو رحمت ہے۔ ترحم اور شفقت سے رونا آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل ہوگا اور آپ کی حالت یہ تھی کہ آپ کو صاحبزادہ کے انتقال پر رونا آیا۔ پس معلوم ہوا کہ رونا کمال کے منافی نہیں۔ جو کامل ہوتا ہے اس کو ایسے واقعات میں ضرور رونا آتا ہے اور یہ شخص صاحب مقام ہوتا ہے۔

البتہ صاحب حال نہیں روتا۔ عوام اہل حال کو کامل سمجھتے ہیں مگر واقع میں کامل وہی شخص ہے جو بیٹے کے مرنے پر روتا ہے۔ بظاہر تو اس کا رونا مبتدی کے مشابہ ہے مگر واقع میں مشابہ نہیں۔ مبتدی کا رونا تو محض داعیہ نفس (۱) کی وجہ سے ہوتا ہے منتہی کا رونا ترحم کی وجہ سے ہوتا ہے اس کے اور اس کے رونے میں بہت فرق ہے اور صرف رونے ہی میں نہیں بلکہ اس کے اور اس کے کھانے پینے اور ہر بات میں بہت فرق ہے۔ گو ظاہری صورت دونوں کی یکساں ہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے عوام نے انبیاء کو نہیں پہچانا اور ان کو ظاہری نظر

(۱) نفس کے تقاضے سے۔

سے اپنے ہی مثل سمجھے۔ کیونکہ ان کی ظاہری حالت کوئی ممتاز نہ تھی اسی واسطے تو حضرت ہود کے بارے میں ان کی قوم نے کہا تھا: مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ۔ (۱)

غرض کہ اہل حال کو اہل مقام سے افضل سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ پس اہل حال کی رضا طبعی ہوتی ہے اور اہل مقام کی رضا عقلی۔ رضا ان میں بھی ہوتی ہے مگر وہ طبعی رضا سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ پس یہ درجہ میں اہل حال سے زیادہ ہیں۔

تفویض اور راحت

یہاں ایک شبہ اور ہوسکتا ہے وہ یہ کہ جب اہل حال کو رونا نہیں آتا اور اہل مقام کو رونا آتا ہے تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل حال طبیعت کی پاکیزگی میں اہل مقام سے بڑھے ہوئے ہیں۔ کہ قضا حق سے ان کی طبیعت پر بھی ناگواری نہیں ہوتی۔

بات یہ ہے کہ اہل حال کی طبیعت چونکہ حال کے غلبہ کی وجہ سے بالکل مغلوب ہوجاتی ہے اس لیے ان کی طبیعت نہ واقعات کا پورا ادراک کرتی ہے اور نہ ان سے متاثر ہوتی ہے اور اہل مقام پر چونکہ حال کا غلبہ نہیں رہتا اس لیے ان میں امور طبعیہ پھر عود (۲) کر آتے ہیں۔ مگر عقلی قوت ان کی طبعی قوت سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لیے بمقتضائے طبع ان کو رونا آتا ہے مگر از جارفتہ (۳) نہیں ہوتے۔ حد کے اندر رہتے ہیں اور جب ان کی طبیعت مغلوب نہیں ہے۔ تو پھر رونا کیوں نہ آوے طبیعت تو اسی واسطے ہے کہ اسکو ادراک (۴) ہو اور ادراک نہ ہونا یہ تو اس کا نقص ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام واقعات سے متاثر ہوتے ہیں کیونکہ ان کا

(۱) ''نہیں ہیں یہ مگر ایک بشر تمہاری مثل۔ وہی کھاتے ہیں جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتے ہیں جو تم پیتے ہو'' سورۃ المؤمنون: ۲۳/۳۳ (۲) طبعی تقاضے پھر ظاہر ہوجاتے ہیں (۳) بے قابو (۴) احساس ہو۔

ادراک کامل ہوتا ہے پس معلوم ہوا کہ لطافت طبع میں بھی اہل مقام ہی بڑھے ہوئے ہیں۔ کہ ان پر واقعات کا اثر ہوتا ہے۔ اور اہل حال کی طبع میں چونکہ اس درجہ لطافت نہیں اس لیے ان پر اثر نہیں ہوتا۔ اہل مقام نے تو دو حق ادا کئے۔ طبیعت کا حق بھی ادا کیا اور وہ یہ کہ ان کو رونا آیا اور عقل کا بھی حق ادا کیا (کہ حد سے تجاوز نہیں کیا) اس لیے یہ اہل حال سے زیادہ ہیں۔

اہل اللہ کا حال

بہرحال یہ معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ ان کو اصرار نہیں ہوتا کسی ثمرہ پر کہ فلاں عمل کا ثمرہ مرتب ہو ہی۔ اگر ثمرہ مرتب [1] نہ بھی ہو تو بھی راضی ہیں۔ البتہ الحاح [2] سے دعا کریں گے کہ یا اللہ ایسا کر دیجئے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ حق تعالیٰ ہی کا ان کو ارشاد ہے۔

ان اللّٰہ یحب الملحین فی الدعا[3]

اس وجہ سے وہ الحاح کے ساتھ دعا کرتے ہیں مگر نہ اس طرح کہ اگر دعا قبول نہ ہو تو وہ ناراض ہوں بلکہ وہ اس وقت بھی راضی ہی رہتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ان کو ثمرہ پر اصرار نہیں ہوتا ہاں اصرار بایں معنی ہوتا ہے کہ ان کی حاجت ہے اس کو پیش کرتے ہیں اظہار عبدیت کے لیے حق تعالیٰ کے سامنے مچلتے ہیں کہ ہم ضرور لیں گے۔ جس کی دو وجہ ہیں ایک تو یہ کہ خدا تعالیٰ کی رضا اس میں سمجھتے ہیں دوسرے اس میں عبدیت کا اظہار ہے اس سے وہ اپنی عبدیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ سو ان کا اصرار اس معنی پر ہے۔

باقی اصرار کی نفی جو کی ہے کہ ان کو ثمرہ پر اصرار نہیں ہوتا تو وہ اس معنی پر ہے کہ ان کو ثمرہ نہ ملنے سے پریشانی نہیں ہوتی۔ یہ نہیں ہوتا کہ اگر ثمرہ نہ ملے تو وہ

(۱) نتیجہ مرتب نہ بھی ہو (۲) گڑگڑا کر (۳) ''کہ اللہ میاں دعا میں ضد کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں'' (فتح الباری لابن الحجر ۱۱:۹۵، الدر المنثور للسیوطی ۵:۳۵۶)۔

ناراض ہوجائیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شکایتیں پیدا ہونے لگیں کہ سمجھا کچھ تھا اور ہوگیا کچھ۔ ان کی دعا تو یہ ہوتی ہے کہ ادھر ان کو دعا کے قبول نہ ہونے کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ معاً ہی ان کے قلب میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ خیر وہی ہے جو حق تعالیٰ کی طرف سے واقع ہوا۔ گو کہ ہم اس کے خلاف کو خیر سمجھے ہوئے تھے بس یہ سمجھ کر وہ اسی پر خوش ہوجاتے ہیں جو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ایسی حالت نہیں ہوتی جیسی کہ اہل دنیا کی ہوتی ہے کہ کوئی مرجائے تو یہ ارمان کرتے ہیں کہ اگر چار برس اور زندہ رہتا تو لڑکے کی تعلیم پوری ہوجاتی اور یہ کام ہوجاتا ہے اور وہ ہوجاتا یہ ارمان اللہ والوں کو پیدا نہیں ہوتے۔ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ ایسے ارمان سننے کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے کسی سے کفر کا کلمہ سنیں۔ انہیں یہ بات اتنی گراں معلوم ہوتی ہے۔ جیسے کسی نے ان کے کان میں کفر کا کلمہ ڈال دیا۔ گو مروت کی وجہ سے وہ اس کو ظاہر نہ کریں مگر ان کو اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے میں اس امر کا یقین کیسے دلاؤں۔ اگر کہنے والے کو آپ سچا سمجھیں تو اس کا یقین کر لیجئے۔ ان کی حالت تو تفویض کی ایسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے لیے کچھ تجویز ہی نہیں کرتے کہ بس یہ کام اسی طرح ہو۔

اہل اللہ کا مقام تفویض

اور اس سے بڑھ کر لیجئے ان حضرات کی تفویض اس قدر کامل ہوتی ہے کہ اگر اس میں راحت معلوم ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ کہیں اس میں نفس کا شائبہ نہ ہو۔ وہ اس کو بھی گوارا نہیں کرتے کہ تفویض راحت کی وجہ سے کی جائے یہ چاہتے ہیں کہ خالص تفویض ہو اور کسی نفسانی غرض کا شائبہ بھی نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اہل اللہ میں تفویض ہوتی ہے اور تفویض کے اندر ایک راحت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب کوئی شے بھی مقصود نہ رہے گی تو اب جو بھی واقع ہوگا، اس پر یہ راضی ہوں گے تو پھر پریشانی کہاں۔ پس تفویض کے اندر بڑی راحت

ہے کہ تمام پریشانیوں سے نجات ہوجاتی ہے مگر تفویض سے ان کو راحت بھی مقصود نہیں ہوتی۔ بعض لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں وہ یہ کہ اسی نیت سے خدا تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں کہ اس میں چین ہے (گویا مقصود ان کا تفویض سے چین ہے ایسے لازم کو ملتزم کر لیتے ہیں راحت تو تفویض کے لیے لازم ہے یہ نیت کر کے اس کو ملتزم اور مقصود بنا لیتے ہیں) یہ بڑی غلطی ہے محققین اس کو شرک سمجھتے ہیں۔ وہ تو یوں کہتے ہیں کہ تفویض خدا تعالیٰ کا حق ہے پس اس کو محض رضا حق کے لیے کرنا چاہئے اور یہ شخص اس کو اپنی غرض کے لیے کرتا ہے سو اس نے حق تعالیٰ کے ساتھ اپنی غرض کو شامل کر لیا۔ یہی شرک ہے اس لیے محققین اس کو بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ ایسی تفویض سے پناہ مانگتے ہیں وہ تو یوں سمجھتے ہیں کہ ہم بندے ہیں اور حق تعالیٰ مالک ہیں ان کے حقوق عظمت میں سے ایک حق تفویض بھی ہے۔ وہ حق عظمت سمجھ کر تفویض کرتے ہیں نہ اس غرض سے کہ راحت ہو وہ تو اگر اس کا شائبہ بھی ہو تو پناہ مانگتے ہیں۔

یہ لوگ کس درجہ کے ہوتے ہیں کہ عبادت کے اندر راحت کی نیت سے بھی بچتے ہیں۔ غرض کہ اصلی نیت تو ان کی خدا تعالیٰ کی عظمت کا حق ادا کرنا ہے ہاں راحت اس کو لازم ہوتی ہے مگر وہ اس طرف التفات نہیں کرتے۔

تفویض کا فائدہ

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص دھوپ میں جا رہا ہو اور اس نے کسی جانور کے سایہ کو زمین پر دیکھا اور وہ اس کو پکڑنا چاہتا ہے۔ اب وہ اس کے پیچھے دوڑتا ہے مگر ہاتھ نہیں آتا۔ کسی عاقل نے رائے بتلائی کہ کم بخت یہ کیوں نہیں کرتا کہ جانور کو پکڑ لے سایہ خود تیرے پاس آجاوے گا نادان ہے وہ شخص جو سایہ کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اس کو چاہیے کہ پرند کو پکڑ لے سایہ تو خود اس کے ساتھ ساتھ ہے ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص پرند کو پکڑے گا وہ سایہ کی طرف التفات نہ کرے گا لیکن سایہ خود اس

کے ساتھ ہوگا۔

تو جیسے اس شخص کے ہاتھ میں پرند ہے اور باوجود سایہ کی طرف التفات نہ ہونے کے سایہ اس کو لازم ہے اسی طرح تفویض کے لیے راحت لازم ہے تفویض کو اختیار کرو۔ اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کا حق عظمت ادا ہو۔ پھر راحت تو خود ہی حاصل ہوجاوے گی۔ نادان ہے وہ شخص جو راحت کی غرض سے تفویض کو اختیار کرے غرض یہ کہ جس شخص میں تفویض ہو اس کو کسی طرح پریشانی نہیں ہوسکتی۔ دنیا کی پریشانی تو کیا چیز ہے جو اصلی وقت ہے پریشانی کا جس کا نام فزع اکبر ہے اس میں بھی ایسے لوگوں کو پریشانی نہ ہوگی۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ (۱) اس دن میں ان لوگوں کو ذرہ برابر رنج نہ ہوگا۔ پھر دنیا کی پریشانی تو کیا چیز ہے وہ تو ان کے نزدیک کھیل اور دل لگی ہے پس ایسا شخص دنیا میں کیا رنجیدہ ہوگا۔

نعمت دنیا و آخرت

اب میرا دعویٰ ثابت ہوگیا کہ اہل سلطنت کو بھی راحت نصیب نہیں ہوسکتی۔ کسی جگہ پناہ ڈھونڈے نہ ملے گی۔ اگر پناہ ہے تو اس میں ہے جس کو حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۲)

میرے بیان سے معلوم ہوگیا کہ فلاح اور کامیابی کا کون سا طریقہ ہے۔ کامیابی کا وہی طریقہ ہے جو خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے نہ وہ جو ہم لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے اسی واسطے لفظ بل لاکر فرمایا: بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا۔ (۳) کہ جو حقیقتاً طریقہ فلاح ہے اس کو چھوڑ کر تم نے دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے

(۱) الانبیاء: ۱۰۳ (۲) ''کہ دلوں کو راحت اللہ کے ذکر ہی سے نصیب ہوتی ہے'' الرعد: ۲۸ (۳) الاعلیٰ: ۱۷۔

کہ آخرت پر دنیا کو ترجیح دیتے ہو۔ سو یہ طریقہ نہیں فلاح کا بلکہ دوسرا طریقہ ہے۔ پس ہم لوگوں میں جو یہ مرض ہے کہ حیات دنیا کو آخرت پر ترجیح دے رہے ہیں اس آیت میں حق تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے یہ مرض ہمارے اندر عام ہو رہا ہے اسی وجہ سے میں نے اس وقت اس آیت کو لیا ہے چنانچہ ہر وقت ہمیں یہی فکر ہے کہ کسی طرح سے دنیا ہو۔ مال و دولت بڑھے دنیا کا طرح طرح کا ساز و سامان ہو۔ دن رات اس میں مبتلا ہیں۔ ہماری یہ حالت ہے۔

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد(۱)

جس وقت دیکھو یہی دھن ہے یہی فکر ہے۔ آگے وجہ شکایت کی بیان فرماتے ہیں۔ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۲) کہ آخرت بہتر ہے اور ابقیٰ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ انسان حیات دنیا کو ترجیح دیتا ہے حالانکہ آخرت بہتر اور باقی تر ہے (۳)۔ ترجیح اس کو دینی چاہئے۔ زیادت دو قسم کی ہوتی ہے کمًّا اور کَیْفًا (۴) اسی لیے خیر سے تو آخرت کا کَیْفًا زائد ہونا بیان کیا ہے اور ابقی سے کمّا زائد ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ آخرت دنیا سے کمّا بھی زائد ہے اور کیفًا بھی زائد ہے۔

کمّا تو اس لیے کہ آخرت چونکہ زمانہ کے اعتبار سے ابقیٰ (۵) ہے اور اسکی شان ہے لا تقف عند حد کہ وہ غیر محدود ہے کہ اس کی نہایت ہی نہیں اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں کرسکتا ہے کب تک رہے گی ظاہر ہے کہ غیر محدود چیز کا اندازہ ہی کیا ہوسکتا ہے اس وجہ سے وہ کمّا زائد ہے اور کیفًا اس لیے زیادہ ہے کہ نعمائے آخرت اور نعمائے دنیا میں لذت وغیرہ کے لحاظ سے بھی کوئی نسبت نہیں۔ (۶) حاصل یہ کہ آخرت دونوں اعتبار سے بڑھی ہوئی ہے مگر تم پھر بھی دنیا کو ترجیح دے رہے ہو۔ یہ وجہ ہے شکایت کی۔

(۱) ''جب مرتا ہے مبتلا مرتا ہے جب اٹھتا ہے مبتلا اُٹھتا ہے'' (۲) الاعلیٰ:۱۷ (۳) ہمیشہ رہنے والی (۴) مقدار اور کیفیت کے اعتبار سے (۵) ہمیشہ رہنے والی (۶) دنیا کی کوئی نعمت آخرت کی کسی نعمت کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

ترجیح دنیا کی مذمت

اس مضمون کو سن کر لوگوں کو یہ شبہ ہوا کرتا ہے کہ مولوی بھی عجیب ہیں کہ دنیا کو چھڑانا چاہتے ہیں ایک تو مسلمان مفلس ہیں ہی سواری ان کے پاس نہیں گھر ان کے پاس نہیں یہ اور بھی تباہ کرنا چاہتے ہیں مثل مشہور ہے مرتے کو ماریں شاہ مدار[1] یہ چاہتے ہیں کہ اور بھی مفلس ہو جائیں میں نے اس وجہ سے بھی اس مضمون کو اختیار کیا ہے تا کہ یہ بتلا دوں کہ شارع علیہ السلام کا مقصود کیا ہے آیا دنیا کا چھڑانا مقصود ہے یا کچھ اور مقصود ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو اس مقام پر تؤثرون ارشاد فرمایا: تَطْلُبُوْنَ یا تَکْسِبُوْنَ ارشاد نہیں فرمایا یعنی یہ نہیں فرمایا: بل تطلبون الحیوۃالدنیا کہ تم حیات دنیا کو طلب کرتے ہو یا تکسبون الدنیا کہ تم دنیا کماتے ہو بلکہ یہ فرمایا کہ تم ترجیح دیتے ہو حیات دنیا کو سو اور الفاظ کو چھوڑ کر جو تؤثرون فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا چھڑائی نہیں جاتی دنیا کمانے کو منع نہیں کیا جاتا قرآن شریف میں تو خود ہی ایسا لفظ موجود ہے جس سے اشارہ ہو گیا اس طرف کہ دنیا کا طلب کرنا مذموم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم جو مذمت کر رہے ہیں تو دنیا کی ترجیح دینے پر کر رہے ہیں نہ دنیا کی طلب اور اس کی تحصیل پر۔

طلب دنیا اور حب دنیا میں فرق

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص ہے جس نے جیب میں گنیاں اور پیسے بھر رکھے ہیں سو اس پر تو اس کو ملامت نہ ہوگی کہ پیسوں کو گنیوں[2] کے ساتھ کیوں جمع کر رکھا ہے اب سنئے کہ اس نے یہ کیا کہ جیب میں سے گنیاں تو پھینکنی شروع کر دیں اور اس کے بجائے اور پیسوں کو بھر لیا اس پر اس کو ملامت کی جائے گی۔

(۱) غریب ہی کو ہر ایک ستاتا ہے (۲) سونے کے سکوں کے ساتھ۔

پس اس نے جو گنیوں کے ہوتے ہوئے پیسے حاصل کئے اس پر ملامت نہ ہوگی بلکہ ملامت ایثار پر ہوگی کہ گنیوں کو تو چھوڑا اور پیسوں کو حاصل کیا بس اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ دنیا طلب کرنے اور کمانے پر ملامت نہ ہوگی بلکہ دین کی گنیوں (۱) کے پھینک دینے اور دنیا کے پیسوں کو اختیار کر لینے پر ملامت ہوگی حق تعالیٰ نے توثرون کا لفظ ارشاد فرما کر اس شبہ کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

حاصل یہ کہ دنیا کے ارادہ کرنے کے دو درجہ ہیں ایک ایثار اور ایک محض طلب، ایثار جائز نہیں، رہی طلب اس میں حرج نہیں اگر دنیا کا طلب کرنا ہی مذموم ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیوں فرماتے کہ طلب الحلال فریضة بعدالفریضة کہ طلب کرنا حلال کا فرض ہے بعد اور فرائض کے۔

دوسرے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے بلیغ الفاظ سے ارشاد فرمایا ہے۔ حب الدنیا رأس کل خطیئة (۲) ”کہ دنیا کی محبت تمام خطاؤں کی جڑ ہے“

یوں نہیں فرمایا کہ کسب الدنیا رأس کل خطیئة کہ دنیا کا کمانا تمام خطاؤں کی جڑ ہے کسب کا لفظ چھوڑ کر حب کا لفظ اختیار کیا اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ حب دنیا اور چیز ہے اور کسب دنیا اور چیز اگر کسی کو کسب دنیا کی ضرورت پیش آئی اور اس نے اسباب اختیار کر لئے تو کوئی حرج نہیں۔

علامت حب اللہ

مگر ایک شرط ہے کہ اس کی محبت غالب نہ ہو بلکہ محبت حق تعالیٰ ہی کی غالب ہو۔ جس کی علامت یہ ہے کہ یہ دیکھنا چاہئے کہ تعارض کے وقت یہ شخص کیا کرتا ہے۔ آیا دین کو ترجیح دیتا ہے یا دنیا کو۔ اگر دین کو ترجیح دیتا ہے تو سمجھا جائے گا کہ حب دین غالب ہے اور اگر دنیا کو ترجیح دیتا ہے تو سمجھا جائے گا کہ حب دنیا غالب ہے۔

(۱) دین کے سونے کے سکے پھینکنے (۲) کنز العمال: ۶۱۱۴، مشکوٰۃ المصابیح: ۵۲۱۳، الدر المنثور ۶: ۳۴۱۔

مثلاً کوئی شخص تجارت کرتا ہے اور اس میں کوئی معاملہ خلاف شرع پیش آیا اور اس کے کرنے سے اس کو دنیا کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر شریعت اس کو منع کرتی ہے تو اب تعارض ہوا دین میں اور دنیا میں، اب اگر اس نے نفع دنیا پر خاک ڈال دی اور دین کو اختیار کیا تو سمجھا جائے گا کہ محبت الٰہی اس میں غالب ہے۔ اور اگر دنیا کو لے لیا اور شریعت کو پس پشت ڈال دیا تو سمجھا جائے گا کہ حب دنیا غالب ہے۔

اب اپنی حالت کو دیکھئے کہ جب دنیوی معاملات واقع ہوتے ہیں تو ہم کیا کرتے ہیں۔ بعض لوگ تو دنیا کو ترجیح دیتے ہیں خواہ آخرت کا نقصان ہوجائے یوں کہتے ہیں کہ ہم گنہگار ہیں ہم دنیا دار ہیں یہ پرہیز ہم سے نہیں ہوسکتا۔ بس باتیں بنا کر اور تاویلیں کر کے دنیا کو ترجیح دیتے ہیں دین پر، یہ علامت ہے اس کی کہ یہ لوگ محبّ دنیا ہیں گو معتقد دنیا نہیں۔ معتقد تو دین ہی کے ہیں ورنہ اپنے کو گنہگار کیوں کہتے مگر نرا اعتقاد اطاعت کے لیے کافی نہیں جب تک محبت نہ ہو اسی کو تو عراقی کہتے ہیں۔

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی کہ دراز ودور دیدم رہ ورسم پارسائی (۱)

رہ قلندر کے معنی ہیں رہ محبت۔ رہ قلندر اور رہ پارسائی میں جزوکل کی نسبت ہے نہ یہ کہ رہ قلندر رہ پارسائی کا متبائن ہے (۲)۔ جیسے آج کل لوگ قلندری اسی کا نام سمجھتے ہیں کہ احکام شریعت سے بالکل آزاد ہوجاوے بس مطلب یہ ہوا کہ رہ قلندر جو جامع ہو محبت اور پارسائی کو وہ مجھ کو دکھا۔ کیونکہ بدوں محبت کے صرف رہ پارسائی دور دراز ہے۔ جب تک محبت نہ ہو پارسائی ہو ہی نہیں سکتی۔ واقعی محبت ایسی چیز ہے۔

محبت کا فائدہ

دیکھئے بادشاہ کی ایک اطاعت تو ہوتی ہے قانونی، کہ قانون کی رو سے جتنا کام ذمہ تھا اس کو پورا کر دیا اور ایک بادشاہ کا عاشق ہے اور وہ محبت کی وجہ سے

(۱) ''اے میرے محبوب قلندری کا راستہ میرے لیے مناسب ہے اگر مجھے دکھلا دو کیونکہ پارسائی کا راستہ دور ہے'' (۲) غیر۔

اطاعت کرتا ہے۔ اس میں اور پہلے شخص میں بڑا فرق ہے سو یہ مطلب ہے اس شعر کا نہ وہ جیسا کہ بعض نے غضب ڈھایا ہے کہ نماز روزہ بالائے طاق اور داڑھی اور مونچھ صفاء چٹ کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ اور اپنے آپ کو قلندر سمجھتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ اس میں انہدام ہے تمام شریعت کا(۱) خلاصہ یہ ہے کہ بدوں محبت نرا اعتقاد کافی نہیں تو بس دنیا داروں کو نرا اعتقاد ہے محبت نہیں۔ اور محنت نہ ہو تو پھر طاعت اس کی قسم کی ہوتی ہے کہ

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند تو برون درچہ کردی کہ درون خانہ آئی
بز میں چو سجدہ کردم زز میں ندا برآمد کہ مرا خراب کردی تو بسجدہ ریائی (۲)

یعنی بدوں محبت کے کامل اطاعت نہیں ہوتی اور جس کو محبت ہوگی وہ طاعت میں تو کیا کمی کرے گا وہ تو مصائب سے بھی نہ گھبرائے گا۔ کوئی مصیبت اس کو پریشان نہیں کر سکتی۔ اس کی تو یہ حالت ہوگی جیسے کہ عراقی کہتے ہیں۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی (۳)

یعنی وہ عبادت سے تو کیا گھبراتا وہ تو ہلاکت سے بھی نہیں گھبراتا سو یہ کا ہے کا اثر ہے۔ محبت ہی کا تو ہے پس طریق محبت ایسی چیز ہے اور چونکہ ان لوگوں کو آخرت کی محبت نہیں ہے اس لیے دنیا کو ترجیح دیتے ہیں آخرت پر۔

ارادہ کی تفسیر

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت بل تؤثرون ...الخ میں ترجیح کی مذمت ہے اور جہاں دنیا کے ارادہ پر مذمت آئی ہے تو اس سے مراد خاص ارادہ ہے۔ چنانچہ

(۱) پوری شریعت کو ڈھانا لازم آتا ہے (۲) ''میں بیت اللہ کے طواف کے لیے گیا آداب حرم سے واقفیت نہیں تھی تو صدا آئی کہ باہر کیا کرتے رہے ہو کہ اب گھر میں آئے ہو۔ جب زمین پر سجدہ کیا تو اس سے صدا آئی کہ تم نے اپنے سجدہ ریائی سے مجھے بھی خراب کیا ہے'' (۳) ''دشمن کا یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر تیری خنجر آزمائی کے لیے سلامت رہے''۔

ایک موقع پر حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ۔(۱)

اس آیت میں مطلق ارادہ مراد نہیں بلکہ ارادہ خاص مراد ہے کیونکہ آگے فرماتے ہیں ومن ارادالاٰخرۃ (اور جو شخص آخرت کا ارادہ کرے) پس معلوم ہوا کہ وہ ارادہ دنیا ہے جو مقابل ہے ارادۂ آخرۃ کے۔ یعنی جس میں ارادہ آخرت نہ ہو پس ارادہ دنیا کی دو صورتیں ہوئیں ایک وہ ارادہ دنیا جس کے ساتھ لم یرد الاخرۃ ہو۔ پس اس آیت میں پہلا ارادہ مراد ہے ایک اور موقع پر ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ(۲)

یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا وَلَمْ يُرِدْ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ تقابل قرینہ ہے اس کا۔ اگر کسی مقام پر قرینہ مذکور ہو تو اس کو بھی اس آیت سے مقید کیا جائے گا چنانچہ ایک موقع پر ارشاد فرمایا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ○(۳)

گو کہ یہاں لفظوں میں تقابل نہیں مگر اس کو بھی دوسری آیت کی وجہ سے

(۱) ''یعنی جو دنیا کا ارادہ کرتا ہے تو ہم اس کو جس قدر چاہیں دے دیتے ہیں۔ پھر ہم اس کا ٹھکانہ جہنم کو بناتے ہیں'' سورۃ الاسراء: ۱۸ (۲) جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کو اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو کچھ دنیا (اگر چاہیں) دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں'' سورۃ شوریٰ: ۲۰ (۳) ''جو شخص (اپنے اعمال خیر سے) محض حیات دنیوی (کی منفعت) اور اس کی رونق (حاصل کرنا) چاہتا ہے تو ہم ان لوگوں کے (ان) اعمال (کی جزا) ان کو دنیا ہی میں پورے طور سے بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لیے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ ثواب وغیرہ نہیں اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب (کا سب) ناکارہ (ثابت) ہوگا اور (واقع میں تو) جو کچھ کر رہے ہیں وہ (اب بھی) بے اثر ہے'' سورۃ ہود: ۱۵۔۱۶۔

مقید کریں گے کہ مراد یہ ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا وَلَمْ يُرِدِ الآخرة پس یہ معلوم ہوگیا کہ دنیا کو دین پر ترجیح دینا مذموم ہے اور کسب دنیا مذموم نہیں۔ سو جن صاحبوں کا یہ گمان ہے کہ مولوی دنیا ہی کو چھڑوانا چاہتے ہیں میرے بیان سے ان کے خیال کا غلط ہونا ثابت ہوگیا۔

بقدر ضرورت دنیا کا حصول

میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دنیا کے ہم اتنے معتقد ہیں کہ معترفین بھی اتنے معتقد نہیں۔ آپ تو دنیا کو جائز ہی کہہ رہے ہیں اور ہم اس کو ضروری کہتے ہیں لہٰذا ہم آپ سے دنیا کے زیادہ معتقد ہوئے مگر ضروری ہونے کے ساتھ دوسرا مسئلہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ کہ ضروری چیز بقدر ضرورت اختیار کی جاتی ہے۔ سو دنیا ہے ضرورت کی چیز مگر بقدر ضرورت ہی اس کو اختیار کرنا چاہئے۔ بس بقدر ضرورت اس کو حاصل کرلو۔ اس کو کون منع کرتا ہے اور زینت میں کوئی ضرورت ہے نہیں، اس لیے وہ قابل ترک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ طالب ہیں زینت کے تو وہ دنیا کو ضرورت سے زیادہ چاہ رہے ہیں۔ جو قاعدہ مذکورہ کی بناء پر قابل ترک ہے۔ آیت میں بھی وزینتھا کا لفظ جو بڑھایا ہے اس سے بھی اس کا مذموم ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس پر وعید فرمائی ہے۔

بس طلب کے دو درجے ہوئے ایک طلب بقدر ضرورت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جس سے ضرورت رفع ہوجاوے اور ایک طلب زینت یعنی دنیا کی طلب اس قدر جو ضرورت سے زائد ہو سو اول کی مذمت نہیں، ثانی کی مذمت ہے (۱) کیونکہ اصلی مقصود رفع ضرورت ہے اب جو دنیا اس کے لیے حاصل کی جائے گی وہ مقصود بالغیر ہوگی اور جو اس سے آگے بڑھے گا تو وہ مطلوب بالذات ہوگی اور دنیا کو مطلوب بالذات بنانا یہی قابل مذمت ہے۔

(۱) پہلی کی برائی نہیں دوسری کی برائی ہے۔

مقتضاءِ عشق

اس بیان سے ایک اور آیت کی تفسیر نہایت پاکیزہ ہوگی۔ قرآن شریف میں اُحد کے واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس واقعہ میں بعض صحابہؓ سے لغزش ہوگئی تھی کہ وہ غلطی اجتہادی تھی۔ صحابہ کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے۔ یہ گمان نہ کیجئے کہ جیسے ہم لوگ قصداً مخالفت کرتے ہیں وہ بھی قصداً مخالفت کرتے تھے۔ وہ حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے محبّ تھے۔ گو زبان سے تو محبت کے دعوے زیادہ نہ کرتے تھے مگر ان میں اطاعت کامل درجہ کی تھی۔ اور ہم لوگ زبان سے تو محبت کے بہت دعوے کرتے ہیں مگر ہم میں اطاعت خاک نہیں ہماری اور ان کی محبت میں یہ فرق ہے مولانا فرماتے ہیں:

گرچہ تفسیر زباں روشن گرست لیک عشق بے زباں روشن ترست (۱)

عاشق کامل وہ ہے کہ اپنے دعوئے عشق کو بھی فنا کردے (۲) کیونکہ فنا، عشق کے لوازم سے ہے (۳) محبوب کے سامنے دعوے کو فنا ہی کر دینا چاہئے سو محبت وہی ہے جس میں فنا ہو اور دعویٰ نہ ہو۔ صرف دعوے کرنے کا نام تو محبت نہیں ہے۔ آخر اس کی کوئی علامت بھی ہے کیا عشق کی یہ علامت ہے کہ محبوب ایک راستہ پر لے چلے اور یہ دوسرے راستہ پر چلے۔ ہرگز نہیں عاشق تو وہ ہے کہ محبوب کے راستہ پر ہولے۔ پس ہم لوگ جو عشق کا دعویٰ کرتے ہیں اور حضور کے طریقہ پر نہیں چلتے۔ سو یہ کیسا عشق ہے عاشق کو تو محبوب کے سامنے مٹ جانا چاہیے۔

اس کی تو یہ حالت ہوگی جیسے کہ ایک عابد کی حکایت ہے کہ وہ کسی صومعہ (۴) میں رہتے تھے شب و روز عبادت میں مشغول تھے ایک روز آواز آئی کہ تمہاری عبادت قبول نہیں، خواہ کچھ بھی کرو۔ مگر وہ پھر بھی عبادت ہی میں مصروف

(۱) ''عشق زباں کو روشن گر اور عشق بے زبان کو روشن تر فرمارہے ہیں'' (۲) عشق کے دعوے کو بھی مٹادے (۳) خود کو مٹانا عشق کے لوازمات میں سے ہے (۴) عبادت خانہ۔

رہے۔ان کے ایک مرید نے کہا کہ تمہیں کیا مصیبت آئی ہے کہ وہ تو رخ پھیرتے ہیں اور تم اس قدر مشقت اٹھاتے ہو وہ تو دھتکارتے ہیں اور تم لپٹے جاتے ہو۔آخر غیرت بھی کوئی چیز ہے اس پر وہ رونے لگے اور کہا کہ یہ تو میں جب کروں کہ اور کوئی در ہو کہ اس در کو چھوڑ کر دوسرے در پر چلا جاؤں۔

توانی ازاں دل بپر داختن کہ دانی کے بے او تواں ساختن

اس شخص سے دل کیسے خالی کر سکتے ہو جس کے متعلق معلوم ہو کہ بغیر اس کے گزر نہیں کر سکتے ہو۔اب تو میرا یہ مذہب ہے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی رضائے تو جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں تو آپ پر قربان ہوں دل آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ پر راضی ہوں۔

خلوص وصدق، خالی تھوڑا ہی جاتا ہے۔بس فوراً آواز آئی۔

قبول ست گرچہ ہنر نیستت کہ جز ماپنا ہے دگر نیستت

قبول ہے اگر چہ کمال کی کوئی بات اسمیں نہیں سوائے اس بات کے کہ تم نے کہہ دیا کہ ہمارے سوا پناہ کی دوسری جگہ نہیں۔

اعمال کی حقیقت

جواب بھی دیا اور اس میں ایک چرکہ محبوبانہ بھی لگا دیا کہ گو تم اس قابل تو ہو نہیں مگر خیر آجاؤ۔ واقعی یہ ہے کہ ہمارے اندر کمال ہی کون سا ہے ہماری کوئی حالت کمال ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمارے پاس بڑی چیز اعمال ہیں۔سو اول تو ان میں ویسے ہی ہزاروں نقصان ہیں۔ پھر اگر کامل بھی ہوئے تو یہ دیکھئے کہ وہ پیدا کہاں سے ہوئے۔ظاہر ہے کہ قوت ارادیہ سے پیدا ہوئے ہیں اور وہ ان ہی کی پیدا کی ہوئی ہے۔ ہاتھ پاؤں اور جتنی چیزیں اعمال کے لیے شرط ہیں وہ بھی ان ہی کی

بنائی ہوئی ہیں۔ ہماری ہے ہی کیا چیز!

ان اعمال کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص ہو، کھیت بھی اسی کا، نوکر بھی اسی کے، پانی بھی اسی کا، زمین بھی اسی کی، بیج بھی اسی کا، غلہ بھی اسی کا۔ یہاں تک کہ کھیتی پیدا ہوئی اب کوئی دعویٰ کرے کہ کھیتی کا میں مالک ہوں تو کیا اس کا یہ دعویٰ صحیح ہوگا۔ مالک یہی کہے گا کہ یہ بتلاؤ کہ تم کون سے قاعدہ سے مالک ہو، ظاہر بات ہے کہ غلہ اسی کی ملک ہے جس کے اسباب ہیں۔ اسی طرح آپ صاحب ذہن ہیں۔ آپ کے ہاتھ پاؤں جو بمنزلہ نوکر اور غلام کے ہیں، خدا کی ملک ہیں۔ آپ کی قوت ارادیہ حق تعالیٰ کی ملک ہے۔ اس مجموعہ سے جو ثمرہ ہوگا وہ دیکھ لو کس کی ملک ہوگا اگر ہمارے اعمال کامل بھی ہوئے تو اس میں ہمارا کیا کمال ہوا۔ اب ان پر جو انعام ہم کو ملے گا وہ مبادلہ تھوڑا ہی ہوگا مبادلہ[1] کے معنی تو ہیں کہ ان کی چیز لے لیجئے اور اپنی دے دیجئے اور یہاں اپنا کچھ ہے ہی نہیں پھر مبادلہ کیسا، فرمائیے کہ پھر کوئی کیا ناز کرسکتا ہے۔ کہ میں کچھ کرسکتا ہوں۔

عبدیت اور رسالت

اس لیے حدیث شریف میں آیا ہے کہ کوئی شخص عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا اس پر حضرت عائشہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور آپ بھی نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپ نے فرمایا کہ میں بھی عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جاؤں گا۔ ہاں اگر حق تعالیٰ اپنی رحمت میں مجھ کو ڈھانپ لیں اور اس میں یہ بھی تصریح فرمادی کہ میں بھی خدا تعالیٰ کی رحمت کا محتاج ہوں اور آپ کا یہ کمال ہے اور جتنا افتقار[2] آپ کا خدا تعالیٰ کی طرف ثابت کیا جائے گا، اسی قدر آپ کی فضیلت ہوگی۔ ایاز کے واسطے یہی فضیلت ہے کہ محمود سے وابستہ رہے۔ اس کی طرف حاجت مند رہے حتی کہ جتنے کمالات بھی ہیں سب عبدیت کی فرع

(۱) بدلہ یعنی عوض نہیں ہوگا (۲) آپ کی خدا کے سامنے جتنی محتاجگی ظاہر کی جائے گی۔

ہیں۔ بڑا کمال عبدیت ہے(۱) اسی لیے جس قدر عبدیت کامل ہوگی اسی قدر رسالت کامل ہوگی کیونکہ عبدیت کی فرع رسالت ہے نہ کہ رسالت کی فرع عبدیت۔ عبدیت تو فطری ہے اور رسالت اس پر مرتب ہے رسالت سے پہلے بھی آپ میں شان تھی اطاعت اور عبدیت کی۔ آپ خدا تعالیٰ کے ایسے عاشق تھے کہ جس وقت تک کچھ بتلایا بھی نہ گیا تھا اس وقت بھی آپ مطیع تھے اسی عبدیت کاملہ کے صلہ میں آپ کو رسالت ملی تھی۔

عمل اور جنت

کوئی یہ سن کر کہ اعمال کی وجہ سے حضور جنت میں نہ جائیں گے یہ نہ سمجھ لے کہ حضور کے اعمال میں کچھ نقصان تھا۔ بات یہ ہے کہ عمل کی وجہ سے جنت میں جانا یہ اعلیٰ درجہ نہیں ہے بلکہ رحمت کی وجہ سے جانا یہی اعلیٰ درجہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ثمرہ تابع سبب(۲) کے ہوتا ہے اگر سبب ناقص ہے تو ثمرہ بھی ناقص ہوگا اور اگر سبب کامل ہے تو ثمرہ بھی کامل ہوگا۔ جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھئے کہ عمل عامل کا کتنا ہی بڑا ہو اور کتنا ہی کامل ہو مگر وہ محدود ہی ہوگا ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ خدا کی رحمت کا کتنا ہی حصہ لے لیا جاوے وہ غیر محدود ہی ہوگا۔ غیر متناہی کا نصف(۳) بھی غیر محدود ہی ہوگا۔ رحمت حق کا اول تو تجزیہ ہو نہیں سکتا لیکن اگر بالفرض کسی درجہ میں کسب نسبت سے تجزیہ ہو بھی تو وہ بھی غیر متناہی ہوگا کیونکہ اگر اس کو متناہی مانا جاوے تو اس سے مجموعہ کا متناہی ہونا لازم آئے گا کیونکہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ مرکب متناہی سے بمرات متناہیہ متناہی ہوتا ہے۔(۴) بہرحال نصف وغیرہ بھی غیر متناہی کا غیر متناہی ہوتا ہے اور پہلے میں مقدمہ عرض کر چکا ہوں کہ سبب مسبب کے تابع ہوتا ہے (یعنی سبب ناقص تو ثمرہ بھی ناقص اور

(۱) سب سے بڑا کمال اللہ کا بندہ ہونا ہے (۲) نتیجہ سبب کے تابع ہوتا ہے (۳) غیر متناہی وہ کہلاتا ہے جس کی کوئی انتہاء نہ ہو (۴) جو مختلف متناہی چیزوں سے مل کر بنی ہے وہ کتنی بھی بڑی ہو اس کی کوئی حد ضروری ہوگی جہاں وہ ختم ہو جائیگی۔

سبب کامل تو ثمرہ بھی کامل) سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ جنت میں اگر آپ کے عمل کی وجہ سے ہوگا تو متناہی ہوگا۔ کیونکہ عمل متناہی ہے اور اگر رحمت کی وجہ سے ہوگا تو غیر متناہی ہوگا کیونکہ رحمت غیر متناہی ہے۔ اس لیے رحمت کی وجہ سے جانا یہی اعلیٰ درجہ ہے۔

غرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل محدود تو ہوگا مگر نعوذ باللہ ناقص نہیں۔ پس عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں کوئی نقصان ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ آپ سے بڑھ کر کسی کا بھی عمل نہیں۔ حضور کے اعمال ہر طرح کامل ہیں مگر چونکہ رحمت حق کی وجہ سے جنت میں جانا اعلیٰ درجہ ہے۔ اس لیے آپ کے اعمال کو سبب نہیں بنایا گیا دخول جنت کا۔ بلکہ اعمال تو کسی حال میں بھی دخول جنت کا سبب نہیں ہوسکتے۔ چاہے کیسے ہی کامل ہوں کیونکہ خود اعمال کا کمال بھی تو رحمت حق ہی پر مرتب ہے۔ پس جب اعمال کا کمال بھی اللہ تعالیٰ ہی کی رحمت کا ثمرہ ہوا تو پھر بندہ کا کیا کمال ہوا جس کی وجہ سے وہ جنت میں داخل کیا جاوے۔ پس کسی کو کیا حق ہے کہ اپنے اعمال پر ناز کرے۔

خیال تو فرمائیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا درجہ ہے مگر پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم یوں فرمارہے ہیں کہ میں بھی جنت میں اپنے اعمال سے نہ جاؤں گا تو پھر ہمارا کیا منہ ہے کہ چار دن نماز پڑھ کر یہ سمجھنے لگیں کہ ہم جنت کے مستحق ہوگئے۔

خلاصہ یہ کہ بندہ کے اندر کوئی کمال نہیں ہوسکتا اگر اعمال بھی کامل ہوں تب بھی بندہ کا کوئی کمال نہیں کیونکہ وہ اعمال بھی خدا تعالیٰ ہی کی رحمت پر مرتب ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں ہے۔ لولا اللّٰہ ما اھتدینا[1] (کہ اگر اللہ میاں رحمت نہ فرماتے تو ہم ہدایت نہ پاتے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کی رحمت نہ ہوتی تو نہ نماز کی توفیق ہوتی نہ

(۱) الصحیح للبخاری: ۵/۱۴۰، ۸: ۱۵۸

روزہ کی۔ ہم ہیں ہی کیا چیز۔ جب یہ ہے تو ہم اس عمل پر کیا ناز کر سکتے ہیں۔ بس رحمت ہی ہے کہ ہمیں عمل کی توفیق ہوتی ہے۔ یہ مضمون تو استطراداً بیان ہو گیا۔

محبت اور اطاعت

اصل میں بیان یہ ہو رہا تھا کہ جب ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر نہیں چلتے تو ہمارا کیا منہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ کریں۔ بلکہ اگر کسی قدر ہم کو محبت بھی ہے تو وہ آپ ہی کی محبت کا عکس ہے۔ دیکھئے ہماری کوئی رات ایسی نہیں کہ درود شریف پڑھنے میں ختم کی ہو۔ بخلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ ہمارے لیے ساری ساری رات کھڑے رہتے اور ہماری بخشش کی دعا کرتے تھے ہماری محبت کا تو صرف یہ حاصل ہے کہ زبان سے دعویٰ ہے محبت کا اور ویسے نافرمانی کرتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی محبت ایسی نہ تھی۔ وہ زبان سے نہ کہتے تھے مگر کرتے تھے۔ صحابہ کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ محبت تھی تو اگر صحابہ سے جنگ احد میں لغزش ہوگئی تو ضرور وہ اجتہادی غلطی ہوگی۔ قصداً ہرگز نہ ہوگی۔

واقعہ یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس آدمی تیر انداز نگہبانی کو گھاٹی پر مقرر کر دیئے باقی لشکر لڑنے لگا جب ان تیر اندازوں نے فتح اور غلبہ دیکھا تو چاہا کہ اس جگہ سے چلے آویں اور فتح میں شریک ہوں اور غنیمت لوٹیں۔ ان کے امیر نے اس سے منع کیا وہ نہ مانے وہاں صرف تھوڑے سے آدمی رہ گئے۔ پس کافروں کی فوج پیچھے سے آپڑی جس کی وجہ سے مسلمانوں کو شکست ہوئی اس میں خطا اجتہادی ان کی یہ تھی کہ وہ لوگ اس مورچہ پر کھڑے رہنے کے حکم کو اس وقت تک محدود سمجھے کہ جب تک غلبہ نہ ہو۔ جب مسلمانوں کا غلبہ دیکھا تو وہاں سے ہٹ گئے۔ اس وجہ سے کہ اب تو غلبہ ہو ہی گیا ہے۔ اب یہاں کھڑے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ غلطی اجتہادی ان سے ہوئی خدا تعالیٰ نے اس قصہ کو بیان کیا ہے

اور پھر فرمایا ہے: مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (۱) یہ قرآن کا جملہ ہے اس پر شبہ ہوتا ہے کہ بعض صحابہ دنیا کے بھی طالب تھے۔ اس کے علماء نے بہت سے جواب دیئے ہیں۔ مگر سب سے اچھا جواب ابن عطار اسکندری کا ہے۔

وہ یہ کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ بعض صحابہ دنیا کے طالب تھے تو جواب یہ ہے کہ ارادہ دنیا مطلقاً مذموم نہیں (۲)۔ ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادہ دنیا للدنیا اور ایک ارادہ دنیا للآخرۃ (۳)۔ پہلا ارادہ مذموم ہے دوسرا مذموم نہیں (۴)۔

خواجہ عبیداللہ احرار کی حالت

چنانچہ حضرت مولانا جامی کا قصہ ہے کہ وہ خواجہ عبیداللہ احرار کی خدمت میں بیعت کے ارادہ سے گئے۔ خواجہ صاحب کے پاس بڑی ثروت تھی (۵)۔ مولانا جامی چونکہ طالب تھے اور طالب بیباک ہوا ہی کرتا ہے۔ اس وجہ سے ان کی یہ حالت دیکھ کر مولانا جامی نے یہ مصرع پڑھا۔

نہ مرد ست آنکہ دنیا دوست دارد

''وہ اللہ والا شخص نہیں جو دنیا کو دوست رکھتا ہے''

اور واپس چلے آئے اور مسجد میں آکر سو رہے۔ خواب میں دیکھا کہ میدان حشر برپا ہے۔ اسی حالت میں کسی صاحب معاملہ نے آکر ان کو پکڑ لیا اور کہا دو پیسے لاؤ۔ فلاں معاملہ میں دنیا میں تمہارے ذمہ رہ گئے تھے۔ اب یہ ہر چند پیچھا چھڑاتے ہیں اور وہ چھوڑتا نہیں۔ اتنے میں دیکھا کہ خواجہ صاحب کی سواری آئی آپ نے فرمایا کہ فقیر کو کیوں تنگ کر رکھا ہے۔ ہم نے جو یہاں خزانہ جمع کیا ہے وہ کس واسطے ہے ان کے ذمہ جتنا مطالبہ ہے اس میں سے ادا کردو۔ ان کے کہنے

(۱) آل عمران: ۱۵۲ (۲) برا نہیں (۳) دنیا کی طلب دنیا کے لیے دوسری دنیا کی طلب آخرت کے لیے (۴) پہلا برا ہے دوسرا نہیں (۵) دولت۔

سے انہیں رہائی ملی۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو دیکھا خواجہ صاحب کی سواری آرہی ہے۔ اب یہ بہت ہی محجوب ہیں(۱)۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ وہ مصرعہ تو پڑھو جو تم نے پڑھا تھا۔ اب یہ شرم کے مارے پڑھتے نہیں اصرار کرنے پر پڑھا۔

نہ مرد ست آنکہ دنیا دوست دارد

''وہ اللہ والا شخص نہیں جو دنیا کو دوست رکھتا ہے''

آپ نے فرمایا کہ ابھی یہ ناتمام ہے اس کے ساتھ یہ اور ہونا چاہیے

اگر دارد برائے دوست دارد

''اگر وہ دنیا کو دوست رکھتا ہے تو محبوب حقیقی کی رضا کے لیے دوست رکھتا ہے''

دنیا اگر ہو بھی تو اپنے واسطے نہ ہو دوست کے واسطے ہو۔ ایسی دنیا میں کیا حرج ہے ان حضرات کے پاس جو دنیا ہوتی ہے وہ حق تعالیٰ ہی کے لیے ہوتی ہے۔ انہیں کے حکم سے اس کو اپنے پاس رکھتے ہیں چنانچہ وہ اس میں مالکانہ تصرف نہیں کرتے بلکہ جہاں ان کا حکم ہوتا ہے وہاں صرف کرتے ہیں۔ آپ کچہری میں جا کر دیکھیں۔ وہاں خزانچی کا عہدہ ہے۔ اس کے سپرد خزانہ کی حفاظت ہے اور وہ مالک نہیں۔ خزانہ میں سے بلا اجازت لے نہیں سکتا۔ اگر وہ خزانہ کو قفل نہ لگائے اور چوری ہو جائے تو اس پر مقدمہ قائم ہو۔ اسی طرح ان حضرات میں سے بعض کو دنیا کی مال و دولت حق تعالیٰ کی طرف سے سپرد کی جاتی ہے۔ اگر وہ اس کو انتظام سے نہ رکھیں تو حق تعالیٰ ان سے ناراض ہوں اور بعض کو یہ حکم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی چیز اپنے پاس نہ رکھیں۔ اہل اللہ کی شانیں مختلف ہوتی ہیں۔

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است بہ عندلیب چہ فرمودہ کہ نالاں است(۲)

ہر ایک کے ساتھ حق تعالیٰ کا جدا معاملہ ہے۔ اسی طرح ہر نبی کی شان جدا

(۱) بہت شرمندہ ہوئے (۲) ''پھول سے کیا کہہ دیا کہ ہنس رہا ہے اور بلبل سے کیا فرما دیا کہ وہ رو رہی ہے''۔

ہے۔ کسی کو کسی صفت سے کام لینے کا حکم ہے۔ کسی کو کسی صفت سے کام لینے کا حکم ہے۔ باقی ان کے اندر تمام صفات ہوتی ہیں۔

کمالات انبیاء

آج کل بعض نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں کتاب لکھی ہے اور آپ کو جامع اوصاف کمالات قرار دے کر اس کو آڑ بنایا ہے دوسرے انبیاء کی توہین کا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تو کمالات ظاہر کئے ہیں اور دوسرے انبیاء پر حملہ کیا ہے۔ ان کی تنقیص کی ہے (۱) لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں سیاست تھی، حکومت تھی، ترحم تھا باقی اور انبیاء میں سے کسی میں سیاست نہ تھی، کسی میں ترحم نہ تھا، کسی میں یہ صفت نہ تھی اور کسی میں وہ صفت نہ تھی۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو اپنے نزدیک مدح کی اور دوسرے انبیاء کی تنقیص کی۔ ان لوگوں کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائیوں کے ساتھ یہ معاملہ ہے۔

اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ہم باپ کی تو تعظیم کریں اور اس کو راضی کریں اور اس کے بھائی کی توہین کریں۔ تو ایسی مدح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کب خوش ہوسکتے ہیں۔ اپنے دعوے کی شہادت پیش کی ہے۔ دیکھو نوح میں ترحم نہیں ترحم کا مادہ کم تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام میں سیاست کا مادہ کم تھا۔ درویشانہ زندگی تھی۔ میرے سامنے یہ کتاب (سیرۃ النبی ﷺ اس کا نام ہے، مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف ہے) لائی گئی۔ کاغذ اس کا نہایت عمدہ سفید، قیمتی، خط نہایت نفیس پر رونق۔ ظاہر تو اس کا ایسا اور اندر اس میں خرافات بھری ہے کہ نوح علیہ السلام میں ترحم نہ تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام میں سیاست نہ تھی۔ کس قدر بے ادبی ہے انبیاء کی شان میں۔ اے صاحبو! یہ کیسے معلوم ہوا کہ ان انبیاء میں یہ مادے نہ تھے۔ کیا مادہ کے لیے ظہور بھی لازم ہے۔

(۱) ان میں نقص نکالا ہے۔

اگر ایک شخص کی بابت معلوم ہوا کہ بڑا سخی ہے۔ آپ اس کے پاس گئے اس وقت دیکھا کہ وہ کچھ بھی خرچ نہیں کر رہا تھا۔ بس آپ نے حکم لگادیا کہ یہ جھوٹ ہے کہ وہ بڑا سخی ہے۔ اس کو یہی کہا جاوے گا کہ جس وقت آپ گئے ظہور کا موقع نہ ہوگا۔ ظہور سخاوت کے موقع پر جا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کتنا بڑا سخی ہے۔ ایسے ہی انبیاء میں سب کمالات موجود ہوتے ہیں مگر خدا تعالیٰ جس کے ظہور کا حکم فرماتے ہیں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ نوح علیہ السلام تو ایسے رحیم تھے کہ نوسو پچاس برس تک قوم کے ہاتھ سے مصائب اٹھاتے رہے۔ مگر بددعا نہیں کی۔ اس سے زیادہ اور کیا ترحم ہوگا۔ کیا نظیر ہوسکتی ہے اس ترحم کی۔ پھر بددعا اس وقت فرمائی جب کہ حق تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آ گیا۔

اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ (اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ)(۱) ''کہ تمہاری قوم میں سے اب کوئی اور ایمان نہیں لائیگا''۔

معلوم ہوا کہ ان میں دونوں مشینیں تھیں۔ نوسو پچاس برس تک ترحم کی مشین چلائی اس کے بعد حق تعالیٰ نے حکم دیا کہ دوسری مشین کو بھی چلادو۔ اب جدھر اللہ تعالیٰ ادھر وہ۔ دیکھو تو نوح علیہ السلام میں ترحم کیسا تھا کہ نوسو پچاس برس تک قوم کی تکلیف پر صبر کیا اور بددعا نہیں کی۔

ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصنف صاحب کے تختۂ مشق بنے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بس وہ تو فقیر اور صوفی تھے۔ ان میں تمدن اور سیاست کہاں تھی۔ ان کی تو یہ تعلیم تھی کہ اگر کوئی ایک گلّہ (۲) پر طمانچہ مارے تو دوسرا سامنے کردو۔ مصنف صاحب مدعی ہیں ان کے ذمہ دلیل ہے اور کیا دلیل ہے اس کی، کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا۔ عدم ظہور سے تو عدم وجود لازم نہیں آتا(۳)۔ دوسرے حدیث سے ثابت ہے کہ اخیر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سلطنت کریں گے۔ ان کے

(۱) سورۃ ہود: ۳۶ (۲) رخسار (۳) کسی چیز کے ظاہر نہ ہونے سے اس کا موجود نہ ہونا لازم نہیں ہے۔

سامنے ساری سلطنتیں مٹ جائیں گی۔ سارے عالم کا انتظام ان کی مٹھی میں ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جب تک سیاست کا مادہ نہ ہو یہ باتیں ان سے کیسے ہوسکتی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سیاست کا مادہ نہ تھا۔

حضرت یہ حالت ہورہی ہے جو جس کے جی میں آتا ہے لکھ مارتا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ انبیاء میں سارے کمالات ہوتے ہیں مگر جس مادہ سے کام لینے کا حکم ہوتا ہے اسی کو کام میں لاتے ہیں۔

شان اولیاء

اسی طرح اولیاء اللہ کی حالت ہے۔ ہر ایک کی جدا شان ہوتی ہے جیسے دنیا کے عہدے ہیں۔ کوئی اہل قلم میں سے ہے اور کسی کو اہل سیف میں سے کیا ہے۔ اسی طرح اولیاء اللہ میں شانیں مختلف رکھی ہیں۔ کسی کو غریب اور کسی کو امیر بنایا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہوتی ہے۔ بعض اولیاء اللہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا دسترخوان بہت وسیع ہوتا تھا اور بعض تنگ دست ہوئے ہیں۔ ہر زمانہ میں ہر شان کے بزرگ پیدا کردیئے ہیں اگر مختلف شانیں نہ ہوں تو کام نہ چلے۔

راز اس کا یہ ہے کہ طالبین مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کے لیے اس کے مناسب حال شیخ کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ ایک شخص نے مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی نسبت مجھ سے کہا کہ وہاں تو کچھ قدر نہیں ہوتی۔ ایسا پیر بتلاؤ جہاں قدر ہو۔ وہاں تو جاکر غلامی کرنی پڑتی ہے۔ سو طالب اس شان کے بھی ہوتے ہیں اگر سارے بزرگ ایسی ہی شان کے ہوں تو بتلایئے ایسا شخص کہاں جائے۔ اس لیے ضرورت ہے مختلف قسم کے بزرگوں کی۔ یہ تو خدا تعالیٰ کا باغ ہے اس میں ہر قسم کے پھول ہیں۔

ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر ست

''ہر پھول کا رنگ اور خوشبو جدا ہے''

کسی کو کسی سے مناسبت ہے اور کسی کو کسی سے۔ کسی کی گردن ایسی جگہ جھکتی ہے جہاں شان وشوکت ہو۔ اس لیے (ایسے مشائخ کی بھی ضرورت ہے) چنانچہ آج کل اکثر مشائخ کے یہاں بہت نرمی کی جاتی ہے اور میرے یہاں گو نہ سختی کی جاتی پس جس کو جونسا مذاق پسند ہو وہ وہاں چلا جاتا ہے۔

اسی طرح دوسرے مشائخ کے یہاں نہ بیعت میں تنگی ہے نہ مریدین کے افعال پر گرفت ہے نہ معمولات اور قواعد معین اور حضرت والا کے یہاں یہ سب باتیں ہیں۔ اور ان کی ضرورت بھی ہے بعض طبائع کو یہ باتیں ناگوار ہوتی ہیں اور وہ اس کو سختی سمجھتے ہیں اور ناقدری خیال کرتے ہیں حالانکہ ان باتوں میں راحت ہی راحت ہے اور خانقاہ کی یہ حالت ہوگئی ہے۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے رابا کسے کارے نباشد(۱)

ان امور کی قدر وہی جان سکتا ہے جس نے وہاں رہ کر دیکھا ہو ان باتوں کے جو فوائد ہیں وہ بیان میں نہیں آسکتے مشاہدہ کے متعلق ہیں جب کہ عقل سے بھی کام لیا جائے ورنہ ظاہر میں تو سختی ہی سمجھے گا۔

ایک شخص ایک بزرگ کی نسبت کہتے تھے کہ کیا اچھی شان ہے کہ ان کے یہاں کھانے کو خوب ملتا ہے۔ ایک شخص ایک بزرگ کی نسبت کہتے تھے کہ اگر ان کے یہاں لوگوں کا کھانا وغیرہ ہوتا تو میں ان کے یہاں کبھی نہ آتا۔ بس یہ سمجھتا کہ لوگ پیٹ کی خاطر یہاں آن پڑے ہیں۔

غرض کہ اہل اللہ مختلف رنگ کے ہوتے ہیں۔ کسی کے اندر امارت کی شان ہوتی ہے اور کسی کے اندر فقیر کا رنگ ہوتا ہے۔ بس اصل مشترک یہ ہے کہ غناء

(۱) ''بہشت وہ جگہ ہے جہاں تکلیف کا نام ونشان نہیں کسی کو کسی سے کوئی کام نہیں ہے''۔

ہوتو وہ خدا تعالیٰ کے لیے اور فقر ہوتو وہ خدا تعالیٰ کے لیے۔

حضرت سلیمان اور سلطنت

حضرت سلیمان کے بارے میں ارشاد ہوا۔ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ(۱) یہ ہماری عطا ہے چاہے کسی کو دیجئے یا نہ دیجئے۔ آپ سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ آپ مواخذہ کے خوف سے جاہ وثروت اور سلطنت سے گھبراتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا هٰذَا عَطَآؤُنَا (یہ ہماری عطا ہے) الخ کہ تم سلطنت سے گھبراؤ نہیں تم سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ آپ کو سلطنت دینے میں خدا تعالیٰ کی حکمت تھی۔ وہ یہ کہ اس وقت میں بڑے بڑے متکبرین اور جابر بادشاہ تھے ان کی گردنیں پست کرنے کے لیے آپ کو ایسی سلطنت دی کہ سب کی گردنیں پست ہوگئیں۔ سب کے دعوے کو توڑ دیا۔ سلطنت تو آپ کا معجزہ تھا۔ سو دیکھئے آپ کے ساتھ یہ برتاؤ تھا کہ آپ تو سلطنت سے گھبراتے تھے اور ادھر سے دلاسا دے دے کر سر کی جاتی تھی۔ بس جس کے لیے جو مناسب ہوتا ہے اس میں اس کو مقید کر دیتے ہیں۔

بہرحال دنیا اگر حد کے اندر ہو تو مذموم نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ارادہ دنیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ارادہ دنیا للدنیا اور دوسرا ارادہ دنیا للآخرۃ(۲)۔ تو جو ارادہ دنیا آخرت کے لیے ہو اس میں کیا حرج ہے۔

ایمان اور تردد

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے حق تعالیٰ سے دعا مانگی کہ جتنا رزق تمام عمر کے اندر میری قسمت میں لکھا ہے وہ مجھے ایک دم سے مل جاوے۔ اس پر خطاب ہوا کہ کیا ہمارے وعدہ پر وثوق نہیں۔ انہوں نے عرض کیا کہ وثوق تو پورا ہے مگر شیطان پریشان کرتا ہے جب عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہوں تو کہتا ہے کہ تو کھائے گا

(۱) سورۃ صاد: ۳۹ (۲) دنیا کی طلب دنیا کے لیے دوسرا دنیا کی طلب آخرت کے لیے۔

کہاں سے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ دے گا تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو سچ ہے کہ اللہ دے گا مگر یہ تو معلوم نہیں کہ کب دے گا۔ وہ مجھے پریشان کرتا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ساری عمر کا ایک دم سے مل جاوے تو اس کو کوٹھری میں مقفل کردوں۔ جب شیطان کہے گا کہاں سے کھائے گا تو فوراً کہہ دوں گا کہ اس کوٹھڑی کے اندر سے کھاؤں گا۔ بس پھر وہ وسوسہ نہ ڈالے گا۔ وہ بزرگ عقلاً تو غالب تھے شیطان پر لیکن طبعاً غالب نہ تھے۔

شبہ کا جواب

اس حکایت کو سن کر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ کیسے بزرگ تھے کہ ان کو حق تعالیٰ پر اطمینان نہ تھا یہ بات تو بزرگی کے خلاف ہے مخلوق کے وعدہ پر تو ایسا وثوق ہوجاوے کہ وسوسہ بھی نہ آوے اور خدا تعالیٰ کے وعدہ پر اتنا بھی وثوق نہ ہو۔ یہ تعجب کی بات ہے اور یہی شبہ اکثر واعظوں کی زبان پر عام مسلمانوں کے حق میں دائر ہوتا ہے کہ کوئی دعوت کرجاوے تو کیسے بھروسہ کرکے بیٹھ جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے وعدہ پر ایسا بھروسہ نہیں۔ مگر سمجھ لیجئے کہ یہ الزام ہے مسلمانوں پر۔ وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے وقت معین نہیں ہے اور ابہام (۱) میں خاصیت طبعیہ ہے بے اطمینانی نہ کہ بے یقینی اور مخلوق کی طرف سے وقت معین ہوتا ہے اور تعین میں خاصیت طبعیہ ہے اطمینان۔ چنانچہ اگر مخلوق کی طرف سے بھی وقت متعین نہ ہو۔ مثلاً کوئی اس طرح دعوت کرے کہ ہم جب دل چاہے ایک وقت کا کھانا بھیجیں گے تو ان کے وعدہ سے بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ وجہ ہے کہ مخلوق کی طرف سے تو اطمینان ہوجاتا ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔ یہ کوئی الزام کی بات نہیں یہ تو امر طبعی ہے ہاں اگر حق تعالیٰ کا وعدہ معین ہوتا پھر اگر کوئی یقین نہ کرتا تو الزام تھا۔

پس چونکہ خدا تعالیٰ کے وعدہ میں تین قسم کا ابہام ہے ایک یہ کہ کب ملے گا۔ ایک یہ کہ کس درجہ سے ملے گا۔ زراعت سے یا تجارت سے یا اور کسی طریقہ

(۱) مبہم وعدہ سے طبعی طور پر بے اطمنانی ہوتی ہے۔

سے۔ ایک یہ کہ کتنا ملے گا پیٹ بھی بھرے گا یا نہیں۔ چنانچہ کبھی کم ملتا ہے اور کبھی زیادہ ملتا ہے۔ اس واسطے تردد ہوتا ہے کیونکہ طبعی بات ہے کہ ابہام سے تردد ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ حق تعالیٰ پر وثوق نہیں اور یہ تردد ایمان کے منافی نہیں بلکہ کمال ایمان کے بھی منافی نہیں۔

مطلق تردد ایمان کے منافی نہیں

سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کا ایمان ہے۔ وہ سب سے زیادہ کامل الایمان ہیں مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں ہے کہ وہ عرض کرتے ہیں۔ وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ (۱) (اور لیکن میرے دل کی تسلی کے لیے) آخر لیطمئن کا کیا مطلب ہے خود واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو کسی درجہ کا تردد تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ میں دیکھ لوں۔ فرمائیے کہ ابراہیم علیہ السلام کو کون سا تردد تھا۔ ظاہر بات ہے کہ وہ تردد تو ہو نہیں سکتا جو منافی ایمان ہو۔ (۲) پس اس سے معلوم ہوا کہ مطلق تردد منافی ایمان کے نہیں۔ ایک فرد تردد کی وہ بھی ہے جو منافی ایمان نہیں۔ تردد کی بہت سی قسمیں ہیں۔ یہ تردد جو حضرت ابراہیم کو تھا ایمان کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے۔ اول تو ابراہیم علیہ السلام کی شان ایسی ہے کہ ان کی نسبت یہ گمان ہو ہی نہیں سکتا کہ ان میں ایسا تردد تھا جو کہ ایمان کے منافی ہے اور پھر قرآن میں اس کی تصریح بھی موجود ہے کہ جب ان سے کہا گیا کہ اولم تؤمن کہ کیا تمہارا اس پر ایمان نہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ بلٰی یعنی ایمان کیوں نہیں۔ میں تو صرف اس لیے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو اطمینان ہوجاوے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یقین آپ کو پورا تھا۔ شک ذرا بھی نہ تھا۔ ہاں تردد کا وہ زمانہ تھا جو اطمینان کے مقابل ہے اور وہ منافی ایمان نہیں۔

(۱) البقرۃ: ۲۶۰ (۲) جس سے ایمان کی نفی لازم آئے۔

قرآن اور ترجمہ

اطمینان عربی کا لفظ ہے جس کے معنی سکون کے ہیں۔ یہ یقین کا مرادف نہیں ہے (۱) البتہ اردو میں اطمینان بمعنی یقین مستعمل ہے۔ ممکن ہے کہ قرآن شریف کے کسی ترجمہ میں اطمینان کا لفظ دیکھ کر اس سے دھوکہ ہوا ہو۔ اور آج کل تو ایسے ترجمے بھی ہو گئے ہیں کہ ان کے اندر ایسے دقیق فرقوں کا لحاظ نہیں کیا گیا یہی تو وجہ ہے کہ قرآن شریف کے ترجمہ میں بہت علوم جاننے کی ضرورت ہے کہ ہر شخص کو ترجمہ دیکھنا بھی نہ چاہئے۔

ایک دفعہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ اس آیت کے متعلق مجھ کو پوچھنا ہے مگر اول اس کا ترجمہ کر دیجئے۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۲) وہ سمجھے ہوئے تھے کہ میں ضـــالاً کا ترجمہ گمراہ کر دوں گا۔ اور گمراہ فارسی میں تو عام ہے اس کو بھی جو واقفیت نہ رکھتا ہو اور اس کو جو واقف ہو کر راہ سے بھٹکا ہو۔ لیکن اردو میں گمراہ اسی کو کہا جاتا ہے جو قصداً راہ سے الگ ہو گیا ہو کسی مترجم نے ضـــالاً کا ترجمہ لفظ گمراہ سے کر دیا ہے بس اس کو دیکھ کر دل میں اعتراض آیا ہوگا۔ میں نے کہا سنئے ترجمہ یہ ہے پایا اللہ تعالیٰ نے آپ کو ناواقف پھر واقف بنا دیا۔ اس کو سن کر چپکے ہی تو ہو گئے۔

اسی وجہ سے میں کہا کرتا ہوں کہ قرآن شریف میں بہت سے علوم کی ضرورت ہے۔ ترجمہ کے مطالعہ کے لیے صاحب کشاف نے مفسر کے لیے چودہ علوم کی ضرورت لکھی ہے میں نے ایک موقع پر (فتح پور کے وعظ میں) ثابت کر دیا تھا کہ اگر نحو نہ جانتا ہوگا تو ترجمہ میں یہ غلطی کرے گا اور فلاں علم سے واقف نہ ہوگا تو یہ غلطی کرے گا۔ خوب واضح طور سے ثابت کر دیا تھا کہ اتنے علوم کی ضرورت ہے۔ قرآن شریف کے ترجمہ کے لیے آج کل ہر شخص اپنے کو مجتہد سمجھتا ہے جیسے کہ لفظ گمراہ ہے۔ اسی طرح لفظ اطمینان بھی ہے یہ اردو میں تو مرادف ہے ایمان کا مگر

(۱) ہم معنی (۲) الضحیٰ: ۹۳/۷۔

عربی میں اس کا مرادف نہیں بلکہ عربی میں اس کے معنی ہیں سکون قلب اور اس کا مقابل ہے تردد یعنی اضطراب قلب یعنی قلب میں حرکت سکون کی قسم کے خلاف ظاہر ہونا۔

وساوس اور اسباب

مطلب یہ ہے کہ اس کا تو یقین ہے کہ آپ زندہ کرنے پر قادر ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ کیسے کریں گے۔ یہ دکھا دیجئے جیسے حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کیا تھا انی یکون لی غلام (۱) کہ یہ تو یقینی ہے کہ آپ بیٹا دینے پر قادر ہیں مگر یہ بتلا دیجئے کہ کس طرح ہوگا۔ آیا ہم میاں بیوی جوان کئے جاویں گے یا اسی حالت میں ہوگا۔ انی استبعاد (۲) کے لیے نہیں انی بمعنی کیف (۳) بمعنی سوال عن الکیفیت کے لیے ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام عرض کرتے ہیں۔ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (۴) کہ آپ کس کیفیت سے مردوں کو زندہ کریں گے۔ اس کی کوئی نظیر دکھا دیجئے۔ اس پر حکم ہوا فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ الخ (پس چار پرندے پکڑو) ان کو ہلا لو (۵)۔ پھر ذبح کر کے خوب ان کا قیمہ کر لو اور چار حصے کر کے چار جگہ رکھ دو۔ پھر ان کو پکارو سب دوڑے چلے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا اور پکارا۔ بس سب زندہ ہو کر ان کی طرف چلے آئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آنکھ سے تماشا دیکھ لیا بس اس سے معلوم ہو گیا کہ مطلق تردد نہ ایمان کے منافی ہے اور نہ کمال ولایت کے۔

یہ سالکین کے کام کی بات ہے ان کو بعض اوقات وسوسے گھیرتے ہیں تردد پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے سمجھتے ہیں کہ پہلی حالت کی طرف عود ہو گیا (۶) ہم مردود ہو گئے۔ یہ غلطی ہے بلکہ بات یہ ہے کہ وساوس کے آنے میں بھی حکمت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ پہلے اطمینان کی حالت پیش آ گئی تھی۔ اس وقت ناز ہونے لگا تھا۔ حق تعالیٰ اس کی اصلاح کے واسطے تردد میں گرفتار کر دیتے ہیں۔ خوب سمجھ لینا چاہئے

(۱) آل عمران: ۴۰ (۲) بعید اور ناممکن سمجھنے کے معنی میں نہیں ہے (۳) کیفیت معلوم کرنے کے لیے ہے کہ کیسے ہوگا (۴) البقرہ: ۲۶۰ (۵) مانوس کر لو (۶) پہلی حالت کی طرف لوٹ گئے۔

کہ تردد خطرات وسواس مطلق منافی نہیں کمال کے۔ یہ علامت ضعف کی نہیں۔

خیران بزرگ کی حکایت یہ ہوئی کہ انہوں نے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ یا اللہ مجھے ساری عمر کا رزق ایک دفعہ دے دیجئے تاکہ وسواس سے نجات ہوجاوے۔ تو یہ حضرت جمعیت قلب کے لیے اسباب دنیا اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سال کا وظیفہ عیال کے لیے جمع کر لیتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تعلیم کے لیے ایسا کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ امت کے ضعف کی رعایت فرمائی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نہ کرتے تو امت یوں سمجھتی کہ جائز تو ہے مگر کمال کے خلاف ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کر کے بتلا دیا کہ یہ کمال کے بھی خلاف نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مذاق کے خلاف امت کے مذاق کی رعایت فرمائی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسباب کو ترک فرما دیتے تو باوجود اسباب ہونے کے انکو ذخیرہ رکھتے ہوئے بہت سے متبعین کی طبیعت رکتی... کیا ٹھکانہ ہے اس شفقت کا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بڑا فصیح ہو اور وہ بچہ کی رعایت کر کے توتلا بولنے لگتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ضعف کی رعایت فرمائی۔ اسباب کو اختیار نہ فرماتے تو آپ کا کوئی ضرر نہ تھا۔ بس صرف شفقت تھی جس کی وجہ سے ایسا کیا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسباب کو ایک حد کے اندر رکھا۔

فضیلت آخرت

اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ ہمہ تن اسی کی طرف مصروف ہوجاویں اور ان کو دنیا میں انہماک کا ایک بہانہ ہوجاوے۔ جیسا مشہور ہے کہ ایک شخص نے کسی سے پوچھا تھا کہ تمہیں قرآن میں کون سا حکم پسند ہے، تو کہا كُلُوْا وَاشْرَبُوْا(۱) کہ کھاؤ اور پیو۔ پھر پوچھا دعا کون سی پسند ہے، تو کہا رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا

(۱) البقرۃ:۲/۶۰۔

مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (۱) (اے ہمارے پروردگار ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما)۔

اسی طرح بہت سے نئے تعلیم یافتوں کو صحابہ میں سے وہی حضرات پسند آئے ہیں جو مالدار تھے جیسے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ۔ جہاں مال جمع کرنے کی مذمت ہوتی ہے تو فوراً کہہ دیتے ہیں کہ مال حاصل کرنا تو اچھی چیز ہے۔ دیکھئے یہ حضرات کیسے مالدار تھے اور جو مالدار نہ تھے وہ ان کو پسند نہیں۔ تو بات یہ ہے کہ وہ ان کے مذاق کے موافق ہیں اس لیے پسند ہیں۔

غرض یہ کہ ہمارے اندر کثرت سے بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۲) (بلکہ تم دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو) کا قصہ ہوگیا ہے۔ خاص کر عورتوں میں۔ میں عورتوں سے کہا کرتا ہوں کہ کبھی چوبیس گھنٹے میں کسی وقت تمہیں خدا تعالیٰ بھی یاد آتے ہیں۔ گوٹے، ٹھپے، زیورات کی دھن میں دن رات رہتی ہیں۔ یہ حالت ہے کہ آج ایک زیور بنایا ہے۔ کسی عورت کے پاس دوسرے نمونہ کا دیکھ لیا اب اس کو میاں سے ضد کر کے تڑوا رہی ہیں۔ اور دوسرے نمونہ کا بنوا رہی ہیں۔ وہ سمجھاتا بھی ہے مگر اسکی سمجھ میں نہیں آتی۔ جب تک بنوا نہ لیں چین ہی نہیں آتا۔ خاوند کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ان میں غالب دنیا کی محبت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کو ترجیح دینا یہ شکایت کی بات ہے نہ کہ دنیا کو طلب کرنا۔ اسی لیے یوں ارشاد فرمایا: بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا اور یہ نہیں فرمایا بل تطلبون الدنیا آگے فرماتے ہیں وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى یعنی (تم دنیا کو ترجیح دیتے ہو) حالانکہ آخرت خیر بھی ہے اور ابقیٰ بھی ہے (۳) اس کو ترجیح دینا چاہیے نہ دنیا کو کیونکہ آخرت دو وجہ سے دنیا پر فضیلت رکھتی ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ خیر یعنی بہتر ہے دنیا سے کہ محل، اعلیٰ درجہ کے باغ نہریں بہتی ہوئیں جن کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا، نہایت شیریں غرض ہر نعمت اعلیٰ درجہ

(۱) المائدۃ: ۱۱۴ (۲) الاعلیٰ: ۱۶ (۳) بہتر بھی ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والی بھی ہے۔

کی ہوگی۔ دوسرے اس وجہ سے کہ ابقی (باقی رہنے والی) ہوگی کہ یہ تمام نعمتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہوں گی۔ کبھی زائل نہ ہوں گی۔ تندرستی ایسی کہ کبھی سر میں درد تک نہ ہوگا۔

اگر ایک محل ہو نہایت ہی اچھا کہ جتنی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ وہ سب اس میں پائی جاتی ہیں مگر ہو ایک دن کے لیے تو وہ کچھ بھی نہیں اور ایک مکان ہو عمدہ نفیس اور ہو بھی عمر بھر کے لیے تو وہ بڑی دولت ہے۔ تو آخرت میں دونوں صفت جمع ہیں۔ خیر بھی ہے اور باقی بھی۔ واللہ دنیا اور آخرت میں اتنی نسبت بھی نہیں جتنی ایک قطرہ اور سمندر میں نسبت ہے فانی اور باقی میں نسبت ہی کیا۔ (۱)

سو حق تعالیٰ نے شکایت اس کی فرمائی ہے کہ آخرت کو تو اختیار نہیں کرتے ہو اور دنیا کو اختیار کرتے ہو۔ یہاں سے فیصلہ ہو گیا اس کا کہ دنیا کے طلب کرنے کی شکایت نہیں بلکہ دنیا کو ترجیح دینے کی شکایت ہے۔

مومن اور دنیوی متاع

اب میں مخاطبین کو متوجہ کرتا ہوں کہ اپنا اپنا امتحان کر لیجئے۔ جانچ کر دیکھ لیجئے کہ مال و دولت اور دنیوی مشاغل میں آپ سے آخرت ترک ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر ترک ہوتی ہے تو ایسی دنیا قابل احتراز ہے (۲) اور اگر ترک نہیں ہوتی تو وہ حال ہے جیسے شیخ شیرازی فرماتے ہیں۔

گرت مال وزر ہست زرع وتجارت چو دل باخدا ہست خلوت نشینی (۳)

غرض دنیا کو قلب میں سے نکالئے، ہاتھ سے دنیا کو نہ نکالئے۔ ہاتھ سے نکالنے کو ہم نہیں کہتے۔ مولانا نے مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

آب در کشتی ہلاک کشتی ست آب اندر زیر کشتی پشتی است

کیا عجیب مثال ہے۔ پانی اگر کشتی کے نیچے ہو تو اس کے جاری ہونے کا

(۱) ختم ہونے والے اور ہمیشہ باقی رہنے والے میں کیا نسبت (۲) ایسی دنیا سے بچنا چاہیئے (۳) ''اگر مال وزر کھیتی اور تجارت کے مشاغل ہیں اور دل خدا کے ساتھ ہے تو یہ خلوت نشینی ہے''۔

سبب ہے اگر وہ نہ ہو تو چل نہیں سکتی۔ اور جو کشتی کے اندر پہنچ جاوے تو ہلاک کردے۔ مال کی مثال پانی کی سی ہے۔ اگر دل سے باہر رہے تو دین میں معین ہے اور جو دل میں گھس جائے تو باعث ہلاکت ہے۔ مومن کو دینوی متاع کی بھی ضرورت ہے مگر جب کہ باہر رہے قلب سے۔ اسی کی بابت مولانا فرماتے ہیں۔

مال را گر بہر دیں باشی حمول نِعْمَ مَالٌ صَالِحٌ گفت آن رسولؐ(۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: نعم المال الصالح للرجل الصالح(۲) مال سے مدرسہ بنا سکتا ہے۔ مساکین کی خدمت، طلباء کی اعانت کرسکتا ہے، حقوق ادا کرسکتا ہے۔ دوسری قوم کے مقابلہ میں اپنی قوم کی اس سے مدد کرسکتا ہے۔ کتنے نفع کی چیز ہے۔ کون کہتا ہے کہ مال مضر ہے(۳) البتہ حب مال (۴) مضر ہے پس ہاتھ میں رہے۔ قلب میں نہ رہے۔ یہ حالت ہو کہ دل بیار دست بکار(۵)۔

حاصل یہ ہوا کہ وہ شخص دنیا دار نہیں جس کے قلب میں تو محبت ہو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور ہاتھ میں مال رکھتا ہو۔ جس کی علامت یہ ہے کہ اگر لاکھ روپے ملتے ہوں اور دین کا نقصان ہوتا ہو تو وہ دین کے مقابلہ میں لاکھ روپے پر لات ماردے۔ سو ایسا شخص وہی ہوسکتا ہے کہ جس کے دل سے دنیا کی محبت نکل جائے جب محبت دنیا کی دل سے نکال دے گا تو پھر دنیا دار نہ ہوگا۔

تارک الدنیا اور متروک الدنیا

اب اس مضمون کی تکمیل کی ضرورت ہے کہ دنیا کی محبت دل سے نکالے کیسے تاکہ ہر مسلمان اسی طریقے کو اختیار کرے۔ جہاں بی اے، ایم اے کے پاس کرنے کی ضرورت ہے اس دوسرے بی اے، ایم اے کا بھی سامان کرنا پڑے گا۔

(۱) ''اگر مال و دولت کو دین کے لیے حاصل کرو تو ایسے مال کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھا مال فرمایا ہے'' (۲) ''اچھا نیک مال نیک آدمی کا مال ہے'' مسند الامام احمد: ۴/ ۱۹۷، الادب المفرد للبخاری: ۲۹۹، اتحاف السادۃ المتقین: ۸/ ۱۴۹، ۹/ ۸۷ (۳) نقصان دہ (۴) مال کی محبت (۵) دل میں محبوب ہو ہاتھ کام میں مشغول ہوں۔

بس ایک پاس اور کرنا ہوگا اگر کوئی کہے کیا فقیر بناؤ گے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ فقیر تواب ہیں۔ اس وقت فقیر نہ رہوگے۔ اب یہ کیفیت ہے کہ مال تو ہے مگر چین نہیں۔ یہ کیا امارت ہے۔ ہم ایسا امیر بنائیں گے کہ الغنی غنی النفس (غنی وہ ہے جو دل کا غنی ہو) اس وقت حقیقی امیر ہوگے۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غریب تھے۔ آپ کے بارے میں جو مسکین کا لفظ آیا ہے اس کے یہ معنی نہیں جیسے آج کل غریب مسکین ہیں کیا غریب کی یہ شان ہوتی ہے کہ قربانی میں سو اونٹ ذبح کردے سو سو اونٹ مساکین کو تقسیم کردے۔ غریب اسے کہتے ہیں کہ لینے پر مرتا پھرے اور نہ ملے۔ نہ یہ کہ ملتے ہوئے کو چھوڑ دے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے من جانب اللہ حق پوچھا گیا کہ اگر آپ کہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے احد پہاڑ کو سونا کردیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہا کرے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے اللہ مجھ کو تو یہ اچھا معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت ہو تو کھا کر آپ کا شکر بجالاؤں۔ اور جب نہ ہو تو آپ سے مانگوں۔ غریب متروک الدنیا ہوتا ہے (۱) آپ تارک الدنیا تھے (۲)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں سلطنت تھی۔ آپ کو سلطنت کے اختیارات تھے۔ سو اس کو غریب نہیں کہتے۔

غرض کہ آپ کو فقیر ہونے کو نہ کہا جاوے گا۔ یہ غلط ہے کہ مال ومتاع دنیا کا ترک کرایا جاتا ہے۔ نہیں کمائے کھائے ہاں طلب دنیا مذموم طریقہ سے نہ ہو۔

حب حق

یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ حب حق (۳) آپ کے اندر غالب ہو جہاں سب چیزیں حاصل کی ہیں ایک حب حق بھی حاصل کرو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ

(۱) غریب کو دنیا چھوڑ دیتی ہے (۲) آپ نے دنیا کو چھوڑ دیا تھا (۳) اللہ کی محبت۔

حب حق آپ کے اندر بالکل نہیں آپ میں حب حق ہے مگر بہت کمزور ہے۔ اس وقت آپ کی ایسی مثال ہے جیسے چراغ میں تیل بھی ہے، بتی بھی ہے، سارا مصالحہ بھی موجود ہے مگر اس کو ابھارنے کی ضرورت ہے۔ ذرا ابھار دو گے تو روشنی ہو جائے گی۔ آپ کے پاس کمی نہیں کسی چیز کی۔ آپ کے پاس سب کچھ ہے۔ کسی اور سے لینے کی ضرورت نہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

یک سبد پرناں ترا بر فرق سر تو ہمی جوئی لب ناں دربدر(۱)

سب کچھ ہمارے پاس ہے مگر اسے بڑھانے کی ضرورت ہے سو آپ میں حب حق تو ہے مگر غالب نہیں حب حق کا غلبہ ہونا چاہیے اس کی ضرورت ہے۔ شاید آپ یوں خیال کریں کہ تسبیح لینے کو یا مرید ہونے کو کہے گا میں اس کو نہیں کہتا میں یہ کہتا ہوں کہ تھوڑی سی مشقت کی ضرورت ہوگی۔ یہ نہیں کہ تکلیف ہوگی۔ آپ کا کھانا یا سونا چھڑوایا جائے گا۔ مشقت بایں معنی ہے کہ نفس ایک بات کو نہیں چاہتا اور یہاں اس کو کرنا پڑے گا پس مشقت صرف یہ ہے کہ نفس کے خلاف کرنا ہوگا۔

میں اس کی ایک مثال دیتا ہوں جس سے اس کام کے اختیار کرنے میں آسانی ہوگی۔ وہ یہ کہ آپ نے کبھی مسہل (۲) لیا ہوگا۔ اگر خود نہ لیا ہوگا تو دیکھا تو ہوگا ہی۔ طبیب تھوڑے دنوں پرہیز کراتا ہے۔ منضج پلاتا ہے پھر مسہل دیتا ہے۔ جس دن مسہل دیتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ گھر میں بیٹھئے چلئے پھریئے نہیں۔ مسہل میں نہ باتیں کرو، نہ سنو، نہ سوؤ۔ اگر ایسا کیا تو دست نہیں آئیں گے۔ بس تم اس تصور میں بیٹھے رہنا کہ اب آیا دست، اب آیا دست، وہ اس قدر پابندی کراتا ہے پھر بھی صحت کے بعد اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی نہیں کہتے کہ اب مقدمات کا وقت ہے۔ اب فلاں کام درپیش ہے بلکہ سب چھوڑ چھاڑ کر اس

(۱) ''روٹیوں سے بھرا ایک ٹوکرا تیرے سر پر ہے اس کے باوجود تو در بدر روٹیاں تلاش کر رہا ہے'' (۲) دست آور دواء۔

کے تابع ہوجاتے ہیں اور اس کی مخالفت نہیں کرتے۔

بس اسی طرح مشائخ مسہل دیتے ہیں۔ تعجب ہے کہ اس مسہل کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور اِس کو ضروری نہیں سمجھتے۔ طبیب مسہل میں تھوڑی دیر کیلئے مشورہ خلوت کا بھی دیتا ہے اس کو بجان ودل (۱) منظور کرتے ہیں اور اگر شیخ اس کو کہے تو دم نکلتا ہے۔ طبیب تو بڑے بڑے پرہیز کراتا ہے اور یہاں شیخ تھوڑے پرہیز کا مشورہ دیتا ہے یعنی معاصی (۲) کا پرہیز کراتا ہے۔ مگر ان کے ساتھ لوگ الجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لو جی اتنے دن اپنے پاس رہنے کو ہی بتلادیا۔ کوئی اتنی فرصت کہاں سے لائے۔ اتنے دنوں کی خلوت اور خاموشی تجویز کردی۔ کوئی کہاں تک خاموش رہے۔ ان کی تجویزوں پر لوگ الجھتے ہیں اور طبیب کی تجویز پر کوئی نہیں الجھتا۔ طبیب کی تجویز پر بھی تو الجھنا چاہیے کہ بس جی ہم باز آئے علاج سے مگر وہاں کسی کو شبہ نہیں ہوتا۔ یہاں شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو کام طبیب کرتا ہے وہی شیخ کرتا ہے۔ مگر شیخ کو تو الزام دیں اور طبیب کے ممنون ہوں (۳)۔ کیسی تعجب کی بات ہے۔ اگر کوئی کہے کہ تم ساری عمر رگڑتے ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تھوڑے دنوں پرہیز بتلائیں گے۔ ساری عمر نہ رگڑیں گے۔ پھر تو خود ہی چاٹ ایسی پڑجائے گی کہ چھوٹے ہی گی نہیں اور نیز جیسے کہ اپنی اصلاح ضروری ہے بچوں کی بھی ضروری ہے۔ پس خود اپنی بھی اصلاح کرو اور اپنے بچوں کی اصلاح کی بھی ابھی سے فکر کرو۔ کیونکہ بچپن میں اخلاق زیادہ درست ہوتے ہیں اب اس کا طریقہ کیا ہے وہ میں بتلاتا ہوں۔

طریق اصلاح

وہ طریقہ ایک ہی چیز ہے۔ وہ کیا ہے۔ صحبت اہل اللہ۔ اگر کوئی کہے کہ

(۱) دل وجان سے قبول کرتے ہیں (۲) گناہوں کا پرہیز کراتا ہے (۳) احسان مند۔

بچوں کے لیے اتنا خرچ کہاں سے آئے کہ اہل اللہ کے پاس بھیجیں اور وہاں ان کو رکھیں میں کہتا ہوں کہ کیا بچہ کے لیے اتنا نہیں رکھتے۔ ماسٹر کو تنخواہ نہیں دیتے۔ اس کے لیے بائیسکل نہیں خریدتے۔ لندن نہیں بھیجتے۔ کیا سینکڑوں روپے خرچ نہیں کرتے۔ جہاں اور تمام باتوں کا انتظام کرتے ہو اللہ والوں کی صحبت کا بھی انتظام کردو۔

اس کی صورت بہت ہی آسان ہے کچھ مشکل نہیں۔ وہ یہ علاج روحانی کے لیے دو عمل کی ضرورت ہے جس میں ایک جزو یہ صحبت بھی ہے ایک تو یہ کہ روزانہ کوئی وقت لے لو جس میں کسی کام کا حرج نہ ہو۔ تو سب سے زیادہ بیکار وقت سونے کا ہے یہی لے لو۔ بس اس میں سے تھوڑا سا وقت اس کام کے لیے لے کر اس میں یہ کرو کہ کوئی کتاب دین کی بچہ کو دیجئے کہ وہ خود پڑھے یا آپ اس کو سنادیں۔ کوئی دن اس سے خالی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ کبھی کبھی دو دن چار دن جب زمانہ چھٹی اور اسکول کی تعطیل کا ہو صحبت اہل اللہ اختیار کریں بلکہ اگر تمام زمانہ چھٹی کا اس میں خرچ نہ کریں تو یوں کریں کہ اسکول میں مہینہ بھر کی چھٹی ہوتی ہے اس کے دو حصے کریں ایک حصہ کھیل کود میں گزاریں اور ایک حصہ اہل اللہ کی صحبت میں مگر یہ ضرور ہے کہ پہلے انتخاب کسی محقق کا کر لیجئے اور وہ محقق ایسا ہوگا کہ ان پر کچھ تشدد نہ کریگا۔ حتی کہ نماز وغیرہ کو بھی ان سے نہ کہے گا۔ وہ ایسا طرز اختیار کرے گا کہ بلا کہے تمام باتوں کی اصلاح ہوجاوے گی۔ اس کے پاس بیٹھنا ہی سب باتوں کی اصلاح کے لیے کافی ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ روزانہ کا عمل تو وہ ہے کہ کتاب خود پڑھا کرے یا آپ سنایا کریں اور کبھی کبھی کا عمل یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں۔ اول ہی سے ان بچوں کے لیے اس طریق کا التزام کر لیجئے پس اس طریقہ کے اندر دو چیزیں ہوئیں۔ ایک یہ کہ اہل اللہ کی صحبت اختیار کریں۔ دوسرے مسائل دین اور احکام

دین کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں بس اس کا التزام کیجئے اور ابتداء ہی سے کیجئے۔ ابتداء سے کریں گے تو وہ آسانی سے پابند ہوجاویں گے اور اس کے ساتھ عمل کی بھی نگرانی رکھیں گے۔ مثلاً اگر غیبت کریں تو روک دیجئے اور کہئے کہ بری چیز ہے ان کو نفرت دلائیے ان سے کبر کی شان ظاہر ہو تو روک دیجئے اور بتلائیے کہ اس میں یہ خرابی ہے۔ جھوٹ بولے تو اس کی خرابی بتلائیے۔ جماعت کی نماز کے ترک پر تنبیہ کیجئے اگر سکول میں جماعت کی پابندی نہ ہو تو تعطیل کے ایام میں ضرور ہو۔

بچوں کی تربیت

اب تو خود مساجد کی حاضری بھی امراء میں متروک ہوگئی ہے۔ جس کی ایک کھلی خرابی یہ ہے کہ ان حضرات کو مسجد کی ضروریات تک کی خبر نہیں رہتی۔ میں شاہجہان پور گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک مسجد میں گیا تو دیکھا کہ مسجد میں مٹی کے تیل کی ڈبیا رکھی ہوئی ہے اور اس کے دھوئیں سے تمام مسجد کالی ہورہی ہے اور مسجد کے قریب ہی ایک رئیس صاحب رہتے تھے اس وقت ان کے یہاں میری دعوت تھی۔ ان کے یہاں جو گیا تو بجلی کی روشنی تھی۔ میں نے ان کو اس پر شرم دلائی ان کے ہاں تو بجلی کی روشنی ہے اور مسجد میں ڈبیا جلتی ہے تب انہوں نے تیل کا انتظام کیا۔

وجہ یہ ہے کہ مسجد میں جانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ نماز اپنے گھر پڑھتے ہیں جب یہ حالت ہے تو مسجد کی طرف توجہ کیسے ہو۔ کسی چیز پر نگاہ پڑنے سے بہت خیال ہوتا ہے۔

ایک رئیس صاحب تھے۔ میں نے ان سے مسجد میں نماز پڑھنے کو کہا تو کہنے لگے کہ صاحب مسجد کی تو یہ حالت ہے کہ نہ فرش ہی ٹھیک ہے نہ وضو ہی کرنے کا انتظام ہے۔ مسجد میں کیا جاویں میں نے کہا کہ یہ اعتراض تو اپنے ہی اوپر ہے یہ قصور تو آپ کا ہے آپ مسجد کی خبر نہیں رکھتے۔

تو بچوں کو ابتداء ہی سے اس کا پابند کیجئے کہ مسجد میں جماعت سے نماز پڑھا کریں۔اسی طرح بچوں میں بچپن سے یہ بات پیدا کیجئے کہ ان کو مسلمانوں سے اجنبیت نہ ہو۔ ان کو غرباء سے اختلاط (۱) کی تعلیم دیجئے۔ صاحبو! غربا کے ساتھ اختلاط میں دنیوی جاہ بھی ہے ان سے ملوگے تو وہ قدر کریں گے اور امیروں کے ساتھ اختلاط میں کچھ عزت نہیں ہوتی کیونکہ امراء تو خود ہی اینٹھ مروڑ میں رہتے ہیں۔ان کی نظر میں کسی کی وقعت نہیں ہوتی۔ پس یہ مادہ بچپن ہی سے پیدا کرو کہ غرباء سے نفرت نہ ہو۔ یہ باتیں بچپن سے پیدا ہوں گی بڑے ہونے کے بعد پھر ذرا دشوار ہے اسی طرح بچوں کو اس کی تاکید بھی کیجئے کہ لباس خلاف شرع نہ پہنیں۔ دوسری قوموں کی وضع نہ اختیار کریں۔بعض لوگ تشبہ کے مسئلہ میں کلام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صاحب غیر قوموں کے ساتھ تشبہ میں حرج کیا ہے۔کیا کافروں کے ساتھ مشابہ ہونے سے کافر ہوجاویں گے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی مرد زنانہ لباس پہنے تو اس کو کیا کہو گے۔ اگر تشبہ میں خرابی نہیں تو تشبہ بالنساء کیوں نہیں کرتے۔ کوئی عورت کا لباس پہن کر دکھا تو دے عورتوں کا لباس پہننے سے بھی تو عورت نہ ہوگا۔ پھر کیوں نہیں پہنتے۔بس کچھ بھی نہیں دین کو اپنے تابع بنا رکھا ہے یہ بھی تو نہیں کہ اس کے پہننے پر عہدے موقوف ہوں۔بعض اسلامی روش پر ہیں مگر بڑے بڑے عہدے ان کو ملے ہوئے ہیں۔

حاصل یہ کہ بچوں کے لیے صحبت اہل اللہ کا بھی انتظام کیجئے اور تعلیم دین کا بھی سلسلہ رکھئے اور پھر اس پر عمل بھی کرائیے یہ اجمالی تدبیر ہے اصلاح کی یہ تمام عمر کے لیے دستور العمل ہے۔

(۱) غریب لوگوں سے ملنے جلنے کی تعلیم دی جیئے۔

اہل اللہ کی صحبت

اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے کہ عمر کا ایک معتد بہ حصہ سال دو سال ایسا مل جاوے کہ اس میں اہل اللہ کی صحبت متصل میسر ہو جاوے(۱) تو یہ بہت ہی نافع ہے۔ سال بھر نہ ہو تو چھ ماہ سہی یہ بھی نہیں تو چالیس ہی دن سہی۔ حدیث میں اس حد کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اسی کو حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

شنیدم رہروے در سر زمینے ہمیں گفت ایں معما با قرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ بود صاف کہ در شیشہ بماند اربعینے(۲)

بس چالیس دن نکال کر کسی شیخ کامل کے پاس رہ پڑے۔ مگر گھر بار اور جتنے تعلقات ہیں سب کا بندوبست ایسا کر کے جائے کہ قلب کو تشویش نہ ہو(۳)۔ نوکری میں رخصت لے لے۔ غرض بے فکری سے رہے چالیس دن کے لیے اپنے کو بالکل شیخ کے سپرد کر دے۔ شیخ دو کام کریں گے کچھ تو اعمال بتلائیں گے کچھ اوراد۔ اور اس سے بے فکر رہئے کہ تحمل سے زیادہ نہ بتلائیں گے۔ اور وہاں کسی سے تعلق مت رکھو کسی سے بلا ضرورت شدید بولو بھی مت۔ اصل کام ذکر اللہ اور اطاعت الٰہی رکھو چالیس دن میں جو مادہ خبیث آپ کے اندر ہے حسد، غصہ، کبر، حب دنیا وغیرہ وہ سب نکل جائے گا۔ اور جو شبہ یا جو حالت پیش آئے بے تکلف شیخ کے سامنے پیش کر دو اور اطلاع کے بعد اپنے کو شیخ کے سپرد کر دو کہ جو ان کی سمجھ میں آئے وہ کریں۔ علاج مشکل ہو یا آسان سب کو برداشت کرو۔ ہوگا تو آسان ہی مگر اول اول دشواری معلوم ہوگی پھر کوئی دشواری نہ معلوم ہوگی۔

---

(۱) مسلسل میسر آجائے (۲) ایک مسافر سے میں نے کسی ملک میں یہ بات سنی کہ اس نے بہت عمدگی سے یہ معما حل کیا کہ بہتر اور صاف شراب وہ ہوتی ہے جو چالیس روز بوتل میں پڑی رہے تاکہ پرانی ہو کر خوب نشہ آور ہو جائے۔
(۳) دل پریشان نہ ہو۔

حکیم الامت کا طریقہ علاج

چنانچہ میں نے بھی ایک صاحب کا علاج کیا ہے ویسے وہ عالم وفاضل ہیں۔ مگر مجھ کو آثار سے معلوم ہوا کہ ان میں کبر ہے۔ میں نے علاج یہ تجویز کیا کہ خانقاہ والوں کی جوتیاں جھاڑ کر سیدھی کر کے رکھا کریں تا کہ ان کو پہننے میں سہولت ہو۔ اس کو سن کر ان کی یہ حالت ہوئی جیسے گولی ماردی اور خیال ہوا کہ انہوں نے یہ کیا کام بتلایا مگر مجبور تھے کرنا پڑا۔ جوتیاں سیدھی تو کیں مگر عشاء کے وقت کہ کوئی دیکھے نہیں۔ یہ نفس کی خباثت تھی۔ پھر دن کو جوتیاں سیدھی کرنا شروع کیں۔ یہ حالت ہوگئی کہ اول تو وہ شرماتے تھے اب لوگ شرمانے لگے۔ بعض لوگ ان کو منع کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ان سے تعرض مت کرو۔ جیسے کریں کرنے دو۔ چند روز تک تو یہ رہا اس کے بعد میں نے کہا کہ نمازیوں کو وضو کے لیے پانی بھر بھر دیا کرو۔ یہ بھی کیا جب ایک زمانہ گزر گیا تو میں نے کہا کہ بس چھوڑ دو۔ پہلے تو کرتے ہوئے تکلیف ہوتی تھی اب یہ حالت ہوگئی کہ چھوڑتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے ایک تو اس لیے کہ ان کو اس سے ایک مناسبت سی ہوگئی تھی۔ دوسرے نفس کہتا تھا کہ سب کے سامنے ظاہر تو ہو ہی گیا اور لوگ بزرگی کے معتقد بھی ہونے لگے اب یہ کام چھوڑایا جاتا ہے نفس نے کہا کہ اب اگر چھوڑوں گا تو لوگ سمجھیں گے کہ اب پھر انہیں تکبر ہوگیا۔ اب چھوڑنے میں ذلت ہے جیسے پہلے کرنے میں ذلت تھی۔ نفس چھوڑنے میں بڑے رنگ لایا کہنے لگے کہ مجھ کو چھوڑنے کا حکم نہ ہو۔ میں نے کہا کہ بس اب اس کو چھوڑ دو۔ اب یہ کرو کہ نہ کسی سے ملو جلو، نہ بات کرو۔ تنہا حجرہ میں دروازہ بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ پہلے تو کہتے تھے کہ انہوں نے یہ کیا کیا کہ جوتے سیدھے کرنے کو کہہ دیا۔ مگر پھر قسم کھا کر کہتے تھے کہ مجھ کو اس عمل سے اتنا بڑا نفع ہوا کہ سال ہا سال میں بھی نہ ہوتا۔

جس کے اندر کبر ہو یہ تو اس کا علاج ہوا اب فرض کرو کہ کسی میں زینت بہت ہے۔ مانگ پٹی میں ہر وقت لگا رہتا ہے۔ اس کو اس سے فرصت ہی نہیں ہوتی۔ شیخ اس کا علاج یوں کرے گا کہ جھاڑو ہاتھ میں دے گا اور کہے گا سڑک پر جاؤ اور جھاڑو دو۔ مسلمانوں کو آرام پہنچے اس عمل کے کرنے سے وہ شخص زینت کو چھوڑ دے گا۔

پہلے بزرگ اس طرح کرتے تھے۔ وظیفے زیادہ نہ بتلاتے تھے وظیفے تو اب ہوئے ہیں کہ جہاں طالب نے کسی مرض کی شکایت کی بس ایک وظیفہ بتلا دیا۔ امراض کہیں وظیفوں سے جاتے ہیں ان کا ازالہ تو اسی طرح ہوتا ہے یا کسی میں حسد کا مادہ ہے تو شیخ محسود(۱) کے پاؤں دبانے کو کہے گا۔ سائنس کی رو سے اس کا راز یہ ہے کہ اس سے محسود کے دل میں اس کی محبت ہوگی تو پھر اسکو بھی ہوگی اور جب اس کو اس کے ساتھ محبت ہو جاوے گی تو پھر حسد جاتا رہے گا۔ سو اس طریقہ سے ازالہ ہوتا ہے ان امراض کا۔

علم اور اصلاح علم

اب لوگ ان کے مذموم(۲) ہونے کے لیے صرف علم کو کافی سمجھتے ہیں کہ جب ان کی برائی معلوم ہوگئی تو خود ہی چھوٹ جائیں گے۔ خوب سمجھ لو کہ اصلاح کے لیے تنہا علم کافی نہیں۔ دو دو جملے کے سننے سے اصلاح نہیں ہوتی بلکہ عملی صورت سے اصلاح ہوتی ہے۔ اسی کو تو کہتے ہیں۔

صوفی نشود صافی تا درنہ کشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے(۳)

اخلاق کی درستی تو خبیث مادہ کے نکلنے ہی سے ہوگی۔ دیکھئے آپس کی نا اتفاقی سب جانتے ہیں کہ ساری خرابیوں کی جڑ ہے مگر پھر بھی اس کو نہیں چھوڑتے وجہ یہ کہ مذموم ہونے کا علم صرف کافی نہیں۔ اس کے مادہ کو اپنے اندر سے نکالنے

(۱) جس سے حسد ہے اس کے پاؤں دبانے کا حکم دے گا (۲) ان کی برائی کے لیے (۳) ''صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے۔ پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے''۔

کی ضرورت ہے۔ پس سوچنا چاہئے کہ اس کا مادہ کیا ہے جس سے یہ نااتفاقی پیدا ہوتی ہے تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کبر سے پیدا ہوتی ہے۔

اہل اللہ کا کام

حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ لوگ اتفاق اتفاق تو کرتے ہیں مگر ان کو اس کی جڑ معلوم نہیں۔ اس کی جڑ ہے تواضع۔ وہ یہ کہ ہر شخص اپنے کو دوسرے سے کم سمجھے۔ بس اتفاق ہو جائے گا۔ آج کل جو اتفاق نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اتفاق کے معنی سمجھ رہے ہیں کہ دوسرا میرے تابع رہے میں تابع نہ ہوں۔ یہ حالت ہے کہ باپ بیٹوں میں لڑائی بلکہ پیر مرید میں لڑائی یہ اسی وجہ سے ہے کہ ہر شخص اپنے کو بڑا بنانا چاہتا ہے پس اس کی جڑ کبر ہے۔

ان خصائل کو برا تو سب کہتے ہیں۔ مگر ان کو مٹاتے ہیں اہل اللہ۔ ان کے ازالہ کا علاج بس انہیں کو آتا ہے۔ ان کی تجویز پر عمل کرنا چاہیے وہ ان اخلاق ذمیمہ کو نکالیں گے۔ یہ رذائل مٹ گئے تو ساری سعادت کی کنجی ہاتھ میں آ گئی۔ غرض یہ کہ ایک تو وہ یہ کام کریں گے اور دوسرے اوراد میں مشغول کریں گے وہ بھی ایسے جو آپ سے ہوسکیں۔ اللہ کا نام لینے سے نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلق طبعی ہو جاوے گا اللہ سے۔ اس میں یہ خاصیت ہے۔

خلاصہ یہ کہ نفس وقلب کی اصلاح ہو جاوے گی۔ اس کے بعد حدود سے تجاوز نہ کروگے۔ معصیت سے ایسی نفرت ہو جاوے گی جیسے پاخانہ سے۔ اس وقت گناہ چھوڑنا مصیبت ہے اس وقت گناہ کرنا مشکل ہوگا۔ بس کسی قدم پر نافرمانی نہ ہوگی اگر مال بھی ہوگا تب بھی یہ حالت ہوگی کہ جیسے کوئی محبوب اپنے عاشق کو کارخانہ سپرد کرتا ہے۔ عاشق کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کے انتظام میں پھرتا ہے اور اس کے اندر وہی تصرف کرتا ہے جس سے محبوب خوش ہو اس کی مرضی کے

خلاف اس میں کوئی تصرف نہیں کرتا خاص کر جب کہ یہ علم ہو کہ محبوب دیکھ بھی رہا ہے ساری دنیا اس کے پاس ہوگی مگر قلب میں سوائے محبوب کچھ نہ ہوگا۔ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ ان کے پاس بڑے بڑے کارخانے ہیں مگر وہ صغیرہ بھی نہیں کرتے سو اصلاح کا ایک تو یہ اثر ہوگا کہ معاصی سے نفرت ہوجاوے گی۔ دوسرے اس کا یہ بھی اثر ہوگا کہ خلق کی نظر میں جاہ بڑھے گا۔

اہل اللہ کی قوت قلبیہ وجسمانیہ

ایک اور عجیب بات ہے کہ اس سے قوت جسمانی بھی بڑھتی ہے۔ اہل اللہ میں قوت جسمانیہ بھی زیادہ ہوتی ہے۔ گو کہ ان کی ظاہری حالت یہ ہوتی ہے کہ راتوں کو جاگنے اور مجاہدہ کرنے سے دبلے پتلے ہوتے ہیں مگر روح میں افسردگی نہیں ہوتی۔ ہر وقت تازہ رہتے ہیں اور راز تازگی کا یہ ہے کہ ان کو معیت ہے محبوب حقیقی سے ۔ آپ محبوب مجازی کو دیکھ کر زندہ ہوجاتے ہیں۔ جب ادنیٰ سے محبوب کی معیت میں یہ اثر ہے، تو پھر خدا تعالیٰ کی معیت میں کیوں نہ اثر ہو۔ اسی واسطے وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کو معیت ہے حق تعالیٰ سے

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ جنت است آں گرچہ باشد قعر چاہ
ہر کجا دلبر بود خرم نشیں فوق گردوں است نے قعر زمیں
باتو دوزخ جنت است اے جانفزا بے تو جنت دوزخ است اے دلربا(۱)

یہ راز ہے ان کے خوش رہنے کا اور خوش رہنے سے جسمانی قوت زیادہ ہوتی ہے نیز چونکہ ان کو معیت ہوتی ہے محبوب سے ان کا قلب بھی قوی ہوتا ہے۔ آپ ایک ہزار کے جاتے رہنے سے دلگیر ہوں اور وہ لاکھ روپے کے بھی جاتے

(۱) ''جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو جس جگہ محبوب خوش وخرم بیٹھا ہو وہ جگہ آسمان سے بلند تر ہے نہ کہ پست زمین۔ اے پیارے دوست تیرے ہمراہ دوزخ بھی جنت ہے اور اے دلربا تیرے بغیر جنت بھی دوزخ ہے''۔

رہنے سے نہ ہوں۔ یہ حالت ہوتی ہے ان کے قوت قلب بلکہ ان میں جو غریب ہیں ان کی بھی یہ حالت ہوتی ہے۔

ہم نے ایک غریب کو دیکھا کہ وہ کھیتی کرتے تھے ان کو روپے کی ضرورت ہوئی لیکن کہیں سے بلاسود نہ ملتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں سودی قرض نہ لوں گا چاہے کچھ بھی ہو۔ اب ان کی اولاد ہے ان کا بھی وہی طریقہ ہے تھوڑی سی زمین میں کھیتی ہوتی ہے مگر اس قدر غلہ پیدا ہوتا ہے کہ اور کسی کے یہاں اس سے زیادہ زمین میں بھی نہیں ہوتا۔ انہوں نے ایک خراب زمین خریدی تھی۔ وہ ایسی اچھی ہوگئی کہ قصبہ میں ایک زمین بھی ویسی نہیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کو یہ بھی نصیحت کی تھی کہ دودھ کا جانور نہ رکھا جائے کیونکہ اس کی وجہ سے جماعت نہیں ملتی۔ جو جماعت کا وقت ہوتا ہے وہی دودھ دوہنے کا ہوتا ہے۔

ان ہی کی قوم میں ایک رسم یہ بھی تھی کہ لڑکیوں پر روپیہ لیا جاتا تھا۔ ان کو اپنے لڑکے کی شادی کرنی تھی۔ انہوں نے ایک جگہ پیغام دیا وہاں سے روپیہ کی طلب ہوئی۔ انہوں نے صاف انکار کردیا اور کہہ دیا کہ شرع میں ایسا روپیہ لینا حرام ہے۔ اس لیے میں ہرگز نہ دوں گا۔ چاہے شادی ہو یا نہ ہو۔ تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ان کی قوم کے لوگ ہاتھ جوڑتے آئے اور کہا لڑکیاں موجود ہیں ہم روپیہ نہیں لیتے۔

لوگ ہر بات کی سائنس ڈھونڈتے ہیں چنانچہ یہاں پر بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ صاحب اگر دین کے مقابلہ میں دنیا کے فائدہ کو چھوڑ دیا کریں گے تو دنیا کا کام کیسے چلے گا۔ میں کہتا ہوں کہ ہر بات میں خدا کو کیوں نہ دیکھو، انہیں بزرگ کو دیکھ لو کہ انہوں نے دین کے مقابلہ میں دنیا پر لات ماری تو خدا تعالیٰ نے ان کا کام کس طرح چلایا۔

چلہ کی ضرورت

خلاصہ یہ کہ جو دستور العمل میں نے بیان کیا ہے اس پر عمل کیجئے۔ پھر

دیکھئے آپ کی کیا حالت ہوتی ہے۔ اس وقت آپ کی یہ حالت ہوگی کہ اگر دنیا کا زیادہ کاروبار بھی کریں گے تو دل اس کے اندر مشغول نہ ہوگا۔ اس وقت تو آپ کو قدرت نہیں ہے کہ لمبے پیمانہ پر کام کریں اور قلب اس کے اندر مشغول نہ ہو۔ اور جب اصلاح ہوجاوے گی تو پھر بڑے پیمانہ پر بھی کام کروگے تب بھی قلب مشغول نہ ہوگا۔ پس اہل اللہ کے پاس رہنے کے لیے چالیس دن تو ضرور نکالنے چاہئیں۔ اس کے بعد کبھی کبھی کی صحبت کافی ہے۔ یہ ایسا آسان طریقہ ہے کہ ہر کسی کو موقع مل سکتا ہے اس کے بعد اب گنجائش نہیں رہی، اس عذر کی کہ ہم دنیا میں مشغول تھے ہم دین کا کام کیسے کرتے۔ چنانچہ لوگوں کا آج کل یہی گمان ہوگیا ہے اور واقع میں مذاق بگڑ گیا ہے کہتے ہیں کہ اگر دین حاصل کریں گے تو بھوکے مریں گے یہ واقعات میں نے بیان کئے ہیں۔ اس طریق پر یقینی کامیابی ہے۔ اب وہ لوگ بتلائیں تو سہی کہ میں نے کون سی نوکری چھڑائی۔ کون سی مشقت کے کام لیے، اس طریقہ پر عمل کرنے میں کون سی دشواری ہے۔ پس اب ہمت کرکے اس پر عمل شروع کردیجئے جب تم اس طریقہ پر عمل کروگے تو یقیناً کامیابی ہوگی اور پھر تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا (۱) کے مصداق نہ بنوگے۔

حیات آخرت

اب ایک چھوٹی سی بات اس آیت کے متعلق عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ قرآن شریف میں دنیا کے ساتھ تو لفظ حیات لائے۔ مثلاً فرمایا الحیوٰۃ الدنیا اور آخرت کے ساتھ لفظ حیات نہ لائے یوں نہیں فرمایا: وحیوۃ الآخرۃ خیر وابقی (آخرت کی زندگی بہتر اور باقی رہنے والی ہے) یہ کیا بات ہے؟

سو اس میں یہ بتلایا ہے کہ آخرت حیات ہی حیات ہے وہاں ممات کا (۲) کچھ کام نہیں پس اس میں حیات کا لفظ لانے کی ضرورت ہی نہیں۔ حیات آخرت تو

(۱) الاعلیٰ: ۸۷/۱۶ (۲) وہاں موت کا کوئی تصور نہیں۔

جب کہا جاوے گا جب کہ اس میں غیر حیات کوئی اور شے بھی ہو۔ پس جب کہ حیات آخرت ایسی چیز ہے اور لوگ پھر بھی اس کی طلب نہیں کرتے۔ تو اب میں کہہ سکتا ہوں کہ لوگوں نے آخرت کو پہچانا ہی نہیں ورنہ اس کی طرف توجہ تام کرتے بلکہ دنیا کو بھی نہیں پہچانا ورنہ اس کی طرف رخ بھی نہ کرتے۔ دنیا ہی کو پہچان لو اسی کو سوچو اگر اس کی پوری حقیقت سمجھو تو اس مردار کا نام بھی نہ لو۔ تم جو دنیا کے عاشق ہوئے ہو ذرا اس کو دیکھو تو سہی۔

اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کسی بدہیئت عورت نے پوڈر مل رکھا ہو اور دو چار چندھے اس پر عاشق ہو جاویں۔ حضرت دنیا کی بالکل ایسی حالت ہے۔

حال دنیا را بہ پرسیدم من از فرزانہ!
گفت یا خوابے ست یا بادے ست یا افسانہ
باز گفتم حال آنکس گو کہ دل دروے بہ بست
گفت یا غولے ست یا دیوے ست یا دیوانہ(۱)

حقیقت میں دنیا کی ایسی مثال ہے اسی واسطے حق تعالیٰ نے شکایت فرمائی ہے ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾(۲) کہ دنیا ایسی رذیل چیز کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت خیر اور ابقٰی ہے اور ہر چند کہ عورتوں کے متعلق کوئی خاص مضمون ذکر نہیں ہوا۔ مگر جو مضامین بیان ہوئے وہ جیسے مردوں کے لیے نافع ہیں عورتوں کے لیے بھی مفید ہیں۔

کچھ عورتوں کے متعلق

خیر اب چند باتیں خاص ان کے متعلق بھی عرض کرتا ہوں حب دنیا میں ہیں

(۱) ''ایک عقلمند سے میں نے دنیا کا حال دریافت کیا اس نے کہا کہ یا تو خواب ہے یا غول بیابانی یا افسانہ ہے پھر میں نے کہا کہ اس شخص کا حال بیان کرو جس نے اس میں دل لگالیا۔ اس نے جواب میں کہا یا تو وہ بھتنا ہے یا شیطان ہے یا دیوانہ'' (۲) ''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو اور آخرت اس سے بہتر اور باقی رہنے والی ہے'' الاعلیٰ: ۱۶/۸۷۔

تو سب مبتلا مگر یہ زیادہ ہیں۔ ان کو علم کم ہے۔ صلحاء کی صحبت کم کیونکہ یہ گھر سے تو نکل نہیں سکتیں۔ لیکن ان کے لیے یہی تدبیر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ان کو اہل اللہ کی خدمت میسر نہیں تو ان کا کلام تو میسر ہوسکتا ہے بزرگوں کے کلمات اور ملفوظات تو موجود ہیں۔ اگر خود ان سے وعظ نہیں سن سکتیں تو چھپے ہوئے وعظ تو ہیں۔ صورت یہ ہوسکتی ہے کہ عورتیں جمع ہوا کریں۔ جو ان میں پڑھی لکھی ہو وہ پڑھا کرے اور سب سنا کریں۔ جیسے اور دنیا کے کاروبار کرتی ہیں۔ بس ایک اس کو بھی معمول کرلیں۔ جو برکت اہل اللہ کی خدمت میں حاصل ہوتی ہے وہ اس طرح ان کو حاصل ہوجاوے گی۔

ایک یہ کہ ضروری مسائل کی کتابیں پڑھیں یا سنیں اور خیال رکھیں کہ ان کے موافق عمل ہو۔ کوئی بات خلاف شرع نہ ہو۔

ایک یہ کہ اپنے عیوب کو ٹٹولیں اور ان کا علاج کریں۔ کتابیں دیکھنے سے اس کا پتہ چل سکتا ہے۔ اگر کسی بات کا علاج معلوم نہ ہو اور کتاب میں نہ ملے تو اپنے مردوں سے خواہش کریں کہ وہ کسی بزرگ کے پاس لکھ کر بھیج دیا کریں جو وہ تجویز کریں اس کے موافق عمل کریں۔

گناہوں سے بچنے کی تدبیر

ایک تدبیر تمام معاصی (۱) کی مشترک تدبیر ہے۔ اس سے ہر معصیت کا مادہ ضعیف ہوجاتا ہے (۲) اور وہ تدبیر مرد اور عورت دونوں کے کام کی ہے اور یہ کہ جس فعل کا مادہ تقاضا کرے اسے مت کرو۔ مثلاً پرائی عورت کے دیکھنے کو جی چاہا تو نگاہ کو روکو۔ ہرگز مت دیکھو۔ غصہ آئے تو روکو۔ غرض جس مادہ کا تقاضا ہو اس کے خلاف کرو مثلاً ایک شادی ہی ہے اس میں رسومات جو کی جاتی ہیں تو غرض یہ ہوتی ہے کہ نام ہوجاوے منشاء اس کا کبر اور تفاخر ہے اور وہ ہے حرام۔ پس یہ

(۱) تمام گناہوں (۲) کمزور۔

رسومات بھی حرام ہوئیں تو ان کے مادہ کے مغلوب کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ رسومات کو مت کرو۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ناچ گانا ہی رسم ہے ناچ گانے کے علاوہ بس اور کوئی رسم نہیں۔ کھانا کھلانا وغیرہ اس میں رسم کیا ہے تو سمجھ لیجئے کہ ناچ گانے کی کوئی خصوصیت نہیں۔ جتنی باتیں نام کی وجہ سے کی جاتی ہیں وہ سب رسوم قبیحہ ہیں۔

علاج یہ ہے کہ ان قصوں میں مت پڑو۔ جہیز دینے کو طبیعت چاہے خوب دو مگر ساتھ مت کرو۔ دکھاؤ مت۔ لڑکی کو خالی بھیج دو جب گھر واپس آوے تو اس کو ان تمام چیزوں پر قابض بنادو۔ اب اس کی ملک ہوگیا جب چاہے لے جاوے۔ اسے مشورہ دو کہ جس چیز کی بالفعل ضرورت نہیں اسے مت لے جا۔ جہیز کو مجتمعاً مت جانے دو۔ یہ ہے علاج کبر کا۔ نہ یہ کہ ان رسموں کو تو کرتے رہیں اور دل سے فخر اور نام کی نیت نکال دیں یاد رکھو کہ جب تک ان کو ترک نہ کروگے اس وقت تک دل سے فخر اور تکبر ہی نہیں نکل سکتا تاوقتیکہ علاج طریقہ سے نہ کرو ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھ کو ایک وقت میں تعجب تھا کہ علماء بیواؤں کے نکاح کی تاکید اس قدر کیوں کرتے ہیں۔ کیوں اتنا پیچھے پڑتے ہیں۔ بس سمجھا دیا کریں کہ نکاح سنت ہے یا مستحب اصل مقصود تو عقیدہ کی اصلاح ہے اس کو برا نہ سمجھیں۔ ورنہ دوسرا نکاح کرنا واجب تو ہے نہیں یہ شبہ کئی سال تک لازم ہے کہ ان کی اس وحشت کو دور کیا جائے جس کا یہی طریقہ ہے کہ مسلمانوں سے کہا جائے کہ وہ ہمارے دیوتاؤں کے پاس کھڑے ہوکر بہت زور زور سے اذان دیا کریں تاکہ ان کی چمک دور ہو یہ طریقہ مناسب نہیں کہ مسجدوں کی اذان کو بند کیا جائے یا آہستہ کیا جائے کیونکہ اس سے مسلمانوں پر ہمارا راز کھلے گا۔

اسی طرح اس وقت مسلمانوں کو جو مضمون مال سے گھبراہٹ ہے اس کے رفع کرنے کے لیے بھی اسی تدبیر کی ضرورت ہے کہ اس قسم کے مضامین بار بار بیان کئے جائیں میرا یہ مطلب نہیں کہ وحشت رفع کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ

سے چندہ مانگا جائے ہرگز نہیں نہ اس وقت میرا یہ مقصود ہے نہ میرا جی چاہتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے پاس مال ہی کہاں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ان آیات کے صحیح معنی بیان کردیئے جائیں تاکہ ان کی گھبراہٹ اور وحشت رفع ہوجائے یہ جو آپ کو مال کے بیان سے وحشت ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو ان آیات واحادیث کے صحیح معنی معلوم نہیں جس میں انفاق مال کا حکم ہے۔ ہمارے بھائی مسلمانوں کو زیادہ تر کھال کھسوٹوں (۱) سے پالا پڑا ہے۔ اس لیے یہ مال کے ذکر سے گھبراتے ہیں۔ اب چاہے کوئی واعظ کھال کھسوٹ بھی نہ ہو اس سے بھی اگر مال کا ذکر سنتے ہیں تو گھبراتے ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے میرا ایک بھتیجا ایک بار میرے وعظ میں بیٹھ گیا۔ گرمی کا موسم تھا اس کو پیاس لگی اور وہاں پانی کا انتظام نہ تھا۔ وعظ رہا اس کے بعد یہ شبہ مٹ گیا اور سمجھ میں آ گیا کہ واقعی اس پر عمل کرانے کی بھی ضرورت ہے۔ اگر اس پر عمل نہ ہوگا تو عقیدہ سے بھی اس کی برائی نہ نکلے گی۔ اس میں کامیابی جب ہی ہوگی کہ عمل کریں اگر عمل نہ کریں گے تو عیب بھی سمجھیں گی اور جب اس کا رواج ہوجائے گا تب اس کو عیب بھی نہ سمجھیں گی صرف اس کا سمجھ لینا کہ نکاح کرنا چاہیے کافی نہیں تاوقتیکہ نکاح نہ کیا جاوے پس جب تک کہ عملی علاج نہ ہو اس وقت تک عقیدہ کی بھی اصلاح نہیں ہوسکتی۔

علاج شیخ کی اہمیت

اب اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ لوگ یا تو اپنا علاج خود تجویز کریں یا شیخ تجویز کرے۔ دو ہی صورتیں ہیں۔ مگر شیخ کی تجویز کرنے میں دو فائدے ہیں ایک یہ کہ شیخ طبیب ہے علاج کو خوب سمجھتا ہے اس لیے اس کا علاج تجویز کیا ہوا اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔ دوسرے اپنے ہاتھ سے اپنے نفس پر چھری چلانا مشکل

(۱) جو لوگ کھال کھینچنے کے درپے ہیں۔

ہے نشتر لگانا مشکل ہے جیسے محسود(۱) کے خود پاؤں دبانا مشکل ہے اور جب شیخ نے کہا کہ پاؤں دباؤ تو اب آسان ہوجاوے گا شیخ کے کہنے کے بعد اس کے خلاف نہیں کرسکتا۔ ہاں اگر طبع سلیم ہو تو خود بھی علاج سمجھ سکتا ہے مگر پھر بھی شیخ کی تجویز میں جو برکت ہے، وہ کہاں سے لائے گا۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند(۲)

شیخ فلسفی ہے مگر اس کا فلسفہ نہیں (جیسے اہل یونان کا فلسفہ ہے) بلکہ اس کا نورانی فلسفہ ہے۔ اگر کوئی چار تدبیریں یاد کرلے تو شیخ تھوڑا ہی ہوجاوے گا۔

ہزار نکتہ باریک تر زمو ایں جا است نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند(۳)

خلاصہ یہ کہ ایک گر سیکھ لو۔ وہ یہ کہ جس چیز کا تقاضا ہو اور ہو وہ معصیت اسے چھوڑ دو۔ اس سے تقاضا معصیت کا ضعیف ہوجاوے گا۔ ضعیف اس لیے کہا کہ یوں نہ خیال کیا جاوے کہ بالکل زائل ہوجاوے گا۔ بالکل ازالہ نہیں ہوسکتا۔ جیسے شریر گھوڑا کہ وہ پہلے بہت دق کرتا تھا(۴) اب بعد اصلاح کے دق نہیں کرتا مگر کبھی کبھی شرارت لے ہی آتا ہے مگر فرق یہ ہوتا ہے کہ نفس پہلے بہ دشواری قابو میں آتا تھا اب آسانی سے آجاتا ہے۔ مثلاً نگاہ ہٹانا غیر عورتوں سے پہلے نہایت دشوار تھا اب بعد اصلاح کے آسان ہوجاوے گا مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ نفس سے بالکل تقاضا ہی موقوف ہو جاوے ریاضت کا یہ طریقہ بہت عمدہ ہے کہ تقاضا معصیت کے خلاف کرے۔

مداومت کی ضرورت

یہ حاصل ہے سارے تصوف اور اصلاح نفس کا میں سب کو فقیر نہیں بناتا صرف اس پر عمل کرنے کو کہتا ہوں پھر اس میں سختی کیا ہوئی میں کہتا ہوں کہ تہجد نہ پڑھے۔ مگر اللہ کا نام لیجئے اور معاصی کو چھوڑیئے لیکن پھر بھی اس میں نصرت حق کی ضرورت

(۱) جس سے حسد ہو خود سے اس کے پاؤں دبانا مشکل ہے (۲) ''جو شخص بھی چہرہ کو برافروختہ کرے لازم نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہو جیسے جو شخص بھی آئینہ بناتا ہو لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہو'' (۳) ''اس میں ہزار نکتہ بال سے زیادہ باریک ہیں اس راہ میں ہر سر منڈانے والے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ قلندری بھی جانتا ہو'' (۴) پریشان کرتا ہے۔

ہے اور وہ بوسائط (۱) ہوتی ہے کہ شیخ کی طرف رجوع کرے اس لیے کہتے ہیں۔

بے عنایات حق و خاصان حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق (۲)

بس تصوف ایک مرکب تدبیر ہے وہ یہ کہ دواعی نفس کے خلاف کرو اور التجا کرو حق کی طرف، ذکر کرو چاہے پندرہ منٹ ہو مگر نبھا کر کرو جیسے کنواں ایک بالشت روزانہ بھی کھودو مگر کھودو نبھا کر تو سال بھر میں پانی نکل آئے گا۔ کام مداومت سے کرو۔ یہ نہیں کہ کبھی کیا اور کبھی نہ کیا۔

عورتوں کو یہ بھی چاہیے کہ عمدہ کپڑا پہن کر کہیں نہ جائیں۔ جہاں جائیں انہیں کپڑوں سے چلی جائیں جو پہلے سے پہنے ہوئے ہوں۔ اس عمل سے جو حصہ تکبر کا ہے وہ ٹوٹ جائے گا مگر ان کی یہ حالت ہے کہ جہاں جائیں گی لد پھند کر جائیں گی تاکہ شان ظاہر ہو۔ زیور بجتا ہوا، دکھاوے کی یہ حالت ہے کہ کان اگر دوپٹہ سے ڈھکے ہوتے ہیں کہ کسی کی نظر نہیں پڑتی تو کھجلانے ہی کے بہانے سے ظاہر کرتی ہیں کہ ہمارے پاس اتنا ہے اگر اپنے پاس نہ ہو تو مانگ مانگ کر زیور میں لدتی ہیں۔ ان کا خیال زیور اور کپڑے پر رہتا ہے جب ان کا مجمع ہوتا ہے تو اوروں کے زیور اور کپڑے پر نگاہ رہتی ہے چنانچہ دیکھ لیجئے کہ جب مردوں کا مجمع منتشر ہوتا ہے تو کسی کو بھی یاد نہیں رہتا کہ فلاں کی ٹوپی کیسی تھی، کرتا کیسا تھا بخلاف عورتوں کے کہ سب کا زیور اور کپڑا بتادیں گی اس لیے میں کہتا ہوں کہ ان میں حب دنیا کا غلبہ زیادہ ہے۔ علاج یہ ہے کہ خاوند کے روبرو خوب پہنا کریں مگر حالت یہ ہے کہ برادری میں جائیں گی تو خوب بن ٹھن کر اور جب آئیں گی تو فوراً اتار دیں گی۔ تاکہ جس حال میں خاوند نے پہلے دیکھا تھا اسی میں دیکھے اس کا علاج یہ ہے کہ خاوند کے سامنے پہنیں اور کہیں جائیں تو نہ پہنیں ایسے ہی علاج غیبت کا ہے اس میں استغفار کافی

(۱) واسطے سے ہوتی ہے (۲) ''بغیر حکم خداوندی اور خاصان خدا کی عنایت کے اگر فرشتہ بھی ہو تو اس کا ورق بھی سیاہ ہے''۔

نہیں بلکہ مغتاب سے (۱) کہو کہ میں نے تمہاری غیبت کی ہے تم معاف کردو۔

خاوند کے حق میں گستاخی ہوجاوے توبہ کرو۔ اور اس سے معاف کراؤ تم خاوند کو برابر کا دوست سمجھتی ہو کہ اس کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتی ہو یاد رکھو کہ وہ جیسے دوست ہے حاکم بھی تو ہے۔ دوست تو اس واسطے ہے کہ اس کے حقوق ادا کرسکو۔ کیونکہ محبت میں جیسے حقوق ادا ہوسکتے ہیں بغیر محبت کے ادا نہیں ہوسکتے۔ نہ اس لیے کہ اس کے جوتیاں مارو۔ عورتیں اس میں بڑی کوتاہی کرتی ہیں خوش خلقی کے لیے تو سب اور بدخلقی کے لیے شوہر۔ خاوند کی ناراضگی ایسی بری چیز ہے کہ اس سے فرشتے لعنت کرتے ہیں عورتوں کی عادت ہے کہ شوہر کے سامنے زبان درازی بہت کرتی ہیں بھلا اس کو اس طرح تکلیف پہنچانی چاہیے۔ اول تو ہر وقت ہی اس کا مزاج دیکھ کر بات کہو۔ ایسی بات نہ کہو جو اس کو ناگوار ہو لیکن خاص کر جب وہ باہر سے گھر میں آوے تو اس وقت تو ضرور ہی اول اس کے مزاج کو دیکھ لو کہیں کسی سے لڑ کر نہ آیا ہو کسی وجہ سے غصہ میں نہ ہو۔ مگر ان کو ذرا صبر نہیں ہوتا۔ بس آتے ہی ٹانگ لیتی ہیں۔

اب میں بیان کو ختم کرتا ہوں خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس آیت میں اس کی شکایت فرمائی ہے کہ لوگ زندگی دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں حالانکہ آخرت بہتر اور ابقیٰ ہے اس کے متعلق بقدر ضرورت مفصل بیان ہوگیا اور حجت الٰہی قائم ہوگئی اب عمل نہ کرنے پر کوئی عذر نہیں ہوسکتا۔ جو مناسب حال تھا میں نے اپنی طرف سے سب پہنچادیا۔ عمل کرنا آپ کا کام ہے۔

اب میں دعا کرتا ہوں اور حق تعالیٰ سے التجا کرتا ہوں کہ وہ عمل کی توفیق دیں۔ آمین یارب العالمین۔

(۱) جس کی غیبت کی ہے

خلیل احمد تھانوی